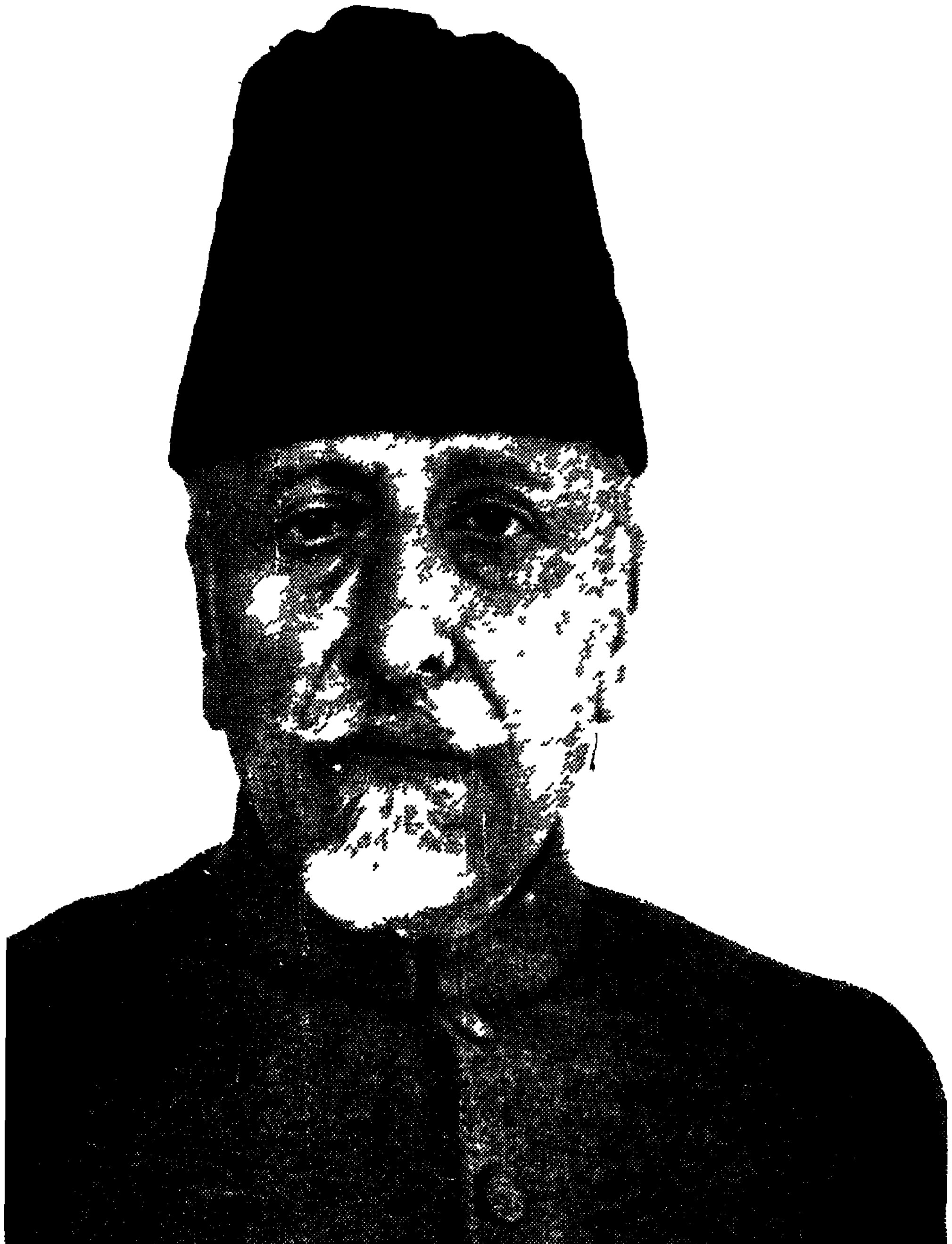
آزاد نمبر



مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مولانا ابوالکلام آزاد نمبر

ماہنامہ

شاہراہ دہلی

فروری و مارچ ۱۹۵۹ء

جلد نمبر ۱۱ ـــــــــــ شمارہ نمبر ۲، ۳

قیمت فی پرچہ
ڈیڑھ روپیہ
یا
ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

•

سالانہ چندہ
دس روپے

•

پرنٹر و پبلشر
محمد یوسف
محبوب المطابع برقی پریس دہلی

•

دفتر
اردو بازار دہلی

ٹیلیفون نمبر ۲۸۷۸۲

مدیر: محمد یوسف (جامی)

....گذارش احوال واقعی

موت دنیا کا کوئی بہت نیا اور عجیب سانحہ نہیں ہے۔ یہ دنیا میں اتنی بار دوہرایا گیا ہے کہ اب ہم اس کو دیکھنے اور اس سے گذرنے کے عادی ہو گئے ہیں لیکن یہ سانحہ اس وقت زیادہ دل شکن اور روح فرسا محسوس ہوتا ہے جب کوئی ایسی شخصیت جس نے وقت اور تاریخ کو بنانے میں حصہ لیا ہو، ہم سے جدا ہوتی ہے۔ موت ایک ایسی ناقابلِ تسخیر طاقت ہے جو اب تک انسانی قوت اور دسترس سے باہر رہی ہے۔ یہی ایک ایسا مقام ہے جہاں انسان کے سرِ پُرغرور کو احساس و اعتراف شکست سے جھکنا پڑتا ہے۔ جہاں یہ بات صحیح ہے کہ دنیا کے طاقتور سے طاقتور اور کمزور سے کمزور انسان کو بالآخر موت کے راستے سے گذرنا پڑتا ہے وہاں اس حقیقت میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ شخصیتیں جو اپنی زندگی ہی میں موت کے دست برد سے باہر نکل جاتی ہیں، مرنے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتیں۔ موت اگرچہ ان کے مادی وجود کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے لیکن ان کے کارنامے، ان کی زندگی اور ان کے وہ تجربے جو انہوں نے دنیا کو دیئے ہیں تاریخ کے صفحات پر باقی رہتے ہیں۔ وہ شمع جو انہوں نے روشن کی تھی کبھی نہیں بجھتی اور رہتی دنیا تک آنے والوں کو راستہ دکھاتی رہتی ہے۔ مولانا انہیں برگزیدہ اور باقی رہنے والی ہستیوں میں سے ایک تھے۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۹ء کو پورا ایک سال انہیں ہم سے رخصت ہوئے ہو رہا ہے، اور ہم پوری صداقت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے نہ ہونے سے ہماری زندگی کے کس کس گوشے اور کن کن شعبوں کو نقصان پہنچا ہے۔

مولانا کیا تھے اور کیا نہیں تھے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر بہت کچھ لکھا جائے گا اور لکھا جا رہا ہے۔ "کیا نہیں تھے" کی بات تو اس وقت سامنے آتی ہے، جب ہم یہ بات سمجھ چکے ہوں کہ وہ در اصل کیا تھے! اس وقت تک تو ہم یہ گتھی بھی نہیں سلجھا پائے ہیں کہ مولانا اپنی مختلف النوع خصوصیات کے اعتبار سے کیا تھے اور کتنی بڑی اہمیت کے مالک تھے۔

ایسی ہستیاں بہت کم وجود میں آتی ہیں جو زندگی کی ہر وادی اور ہر میدان میں اپنا مرتبہ بلند اور اپنا مقام منفرد رکھتی ہوں۔ مولانا کی شخصیت میں زندگی کی مختلف اور متضاد خصوصیات کچھ اس طرح اکٹھی ہو گئی تھیں کہ ہم انہیں "مجموعۂ روزگار" کہنے کے لئے مجبور ہیں۔ علم، ادب، سیاست، مذہب، صحافت، تدبر اور درکِ بصیرت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں ان کی حیثیت قائد اور رہنما کی نہ رہی ہو۔ انہوں نے جس راستے پر بھی اپنے قدم موڑے نئی نئی منزلوں اور نئے نئے راستوں کا سراغ لگایا۔ جس سمت بھی ان کے مرکبِ زندگی کی لگام مڑی، ہر ہمعنان سست رفتار کو غبارِ راہ کی طرح پیچھے چھوڑ کر وہ ہمیشہ آگے نکل گئے۔ سست گامی اور سہل پسندی ان کی فطرت نہیں تھی۔ وہ فطرتاً بہت بلند پرواز اور سریع الرفتار تھے۔ انہیں دوسروں کے نقشِ پا پر چلنا نہیں آتا تھا وہ ہر راہ سے اتنی تیزی سے گذر جاتے تھے کہ دوسرے ان کے نقشِ قدم کو ہی اپنی راہوں کا سراغ لگاتے رہیں۔ صداقت، دور اندیشی، علم، بردباری، معاملہ فہمی اور نکتہ سنجی، جتنی بڑی خصوصیات انسانی عظمت اور بزرگی کی علامت ہو سکتی ہیں ان کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ نڈر، صاف گو اور بے باک تھے۔ بڑی سے بڑی طاقت ان کی حق پسندی اور صداقت کے ستونوں کو متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اگر ایک طرف جنگِ آزادی کے جری اور سرفروش مردِ مجاہد تھے تو دوسری طرف سیاست و حکومت کے عمیق ترین اسرار و رموز کے نکتہ داں ــــــ میدانِ صحافت میں جہاں وہ ایک شعلہ بار اور آتش بقلم صحافی تھے، وہیں علم و ادب کی دنیا میں صاحبِ طرز اور منفرد الاسلوب انشا پرداز۔ اگر ایک طرف سیاست کے میدان میں ان کی باریک بینی اور نکتہ رسی مسلّم تھی، تو دوسری طرف مذہب اور مذہبی رہنماؤں کی صف میں ان کا اجتہاد اور یکتائی مکمل اور مصدقہ ــــــ وقت اور زمانے کی ضرورتوں نے انہیں سیاست کے ہنگاموں میں اس بری طرح پھنسا دیا تھا کہ زندگی میں انہیں اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ ان تمام محفلوں کو اپنے وجود سے گرمی اور روشنی بہم پہنچا سکتے جن کے دروازے فطرت کے ہاتھوں نے ان کے دماغ پر کھول دیئے تھے۔ ایسا اولوالعزم عظیم المرتبت، اور فرض شناس انسان دنیا میں کم ہی پیدا ہوتا ہے جو اپنے فطری تقاضوں کو وقت اور زمانے کی ضرورتوں پر قربان کر دے۔ اور اب یہ فیصلہ مستقبل کا مورخ ہی لکھے کہ مولانا نے ایک ایسے وقت میں، جب ملک اور قوم کو ان کی ضرورت تھی۔ اپنے طبعی میلانات کو نظر انداز کر کے اس کوچے میں قدم رکھا جو کلی طور پر ان کے مزاج اور مذاق کے مطابق نہ تھا اور کس طرح اپنی بلندیٔ عظمت کا ثبوت فراہم کیا؟

مولانا کی وفات یقیناً ایک تاریخی حادثہ ہے، ہندوستان بھر میں ان کی پہلی برسی عزت اور احترام کے ساتھ منائی جا رہی ہے ہم اس موقع پر مولانا جیسی عظیم شخصیت کی یادگار کے طور پر شاہراہ کا آزاد نمبر پیش کر رہے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ زمانہ بار بار ان کے کارناموں کو دوہرائے گا اور تاریخ کے باب ان کی زندگی کے ان گنت کارہائے نمایاں کی یادداشتوں سے نہ جانے کب تک بھرتے رہیں گے۔ یہ ایک سال کا عرصہ جو ان کی مفارقت کے بعد ہم پر گذرا ہے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم پورے خلوص

رختِ سفر

رُباعی

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
میخانے نے رنگ و روپ بدلا ایسا
میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

ابوالکلام آزاد

شاہراہ

اور دیانتداری کے ساتھ اس چیز کا جائزہ لیں کہ ہم نے ان کے بتائے ہوئے اصولوں اور ان کے بنائے ہوئے سانچوں میں کہاں تک اپنی زندگیوں کو ڈھالا ہے ——— مولانا زندگی بھر فرقہ پرستی، منافرت، رجعت اور فرقہ وارانہ اختلافات کے خلاف لڑتے رہے اور اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ ملک میں مفاہمت، تنظیم، رواداری اور بھائی چارے کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہوں کیا ہم نے ان غلاظتوں کو اپنی سرزمین سے دور کر دیا ہے؟ ——— زبان کے مسائل پر مولانا کا ایک صاف اور ایماندار سطح نظر تھا اور وہ یہ کہ زبان کے مسئلوں کو فرقہ پرستی کے عینک سے نہ دیکھا جائے اور مختلف زبانوں کو جذباتی اور سطحی اختلافات سے مغلوب ہو کر تنازعوں کی بنیاد نہ بنایا جائے۔ اور ایک ایسی فضا پیدا کی جائے جس میں ہر زبان کو اپنے اپنے طور پر پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے مواقع ملیں ——— کیا ہم نے اس باب میں ان کے پیغامات اور خواہشات کا احترام کیا ہے؟ ——— مولانا جیسی عظیم شخصیت کے لئے سب سے بڑا خراج تحسین یہی ہو سکتا ہے کہ ہم عملی طور پر ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں اور اس منزل کی طرف اپنے قدم تیز کریں جس کا سراغ ہمیں ان کی قیادت میں مل چکا ہے

ہمیں افسوس ہے کہ شاہراہ کا یہ آزاد نمبر ہماری خواہشات کے مطابق ویسا نہیں ہے، جیسا اس کو ہونا چاہئے تھا ——— ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اس نمبر کے روپ میں ہم کوئی ایسی چیز پیش نہیں کر سکے جس کو ہر لحاظ سے مولانا کی شان کے شایاں کہا جا سکتا ——— تاہم جو کچھ بن پڑا ہے، حاضر کر رہے ہیں

موجودہ صورت حال میں اس کام کے لئے ہمارے سامنے کچھ اتنی پیچیدگیاں اور رکاوٹیں تھیں کہ یہ مختصر سا نمبر بھی پیش کرنا دشوار نظر آتا تھا۔ اپنی کم مائیگی، تہی دامانی اور کئی دوسری مشکلات کو دیکھتے ہوئے یہ ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ مولانا مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر "نمبر" جیسی کوئی چیز پیش کی جائے۔ تاہم راستے کی رکاوٹوں پر اشتیاق و جذبات کے طوفان نے غلبہ پایا اور وقتی طور پر دوڑ دھوپ کر کے جو کچھ ہم اکٹھا کر سکے اسی کو "آزاد نمبر" کی شکل میں پیش کر دینا ہم نے مناسب سمجھا۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کے حلقے میں ہماری اس "کوشش ناتمام" کو سراہا جائے گا اور کم سے کم اس بات کی داد دی جائے گی کہ مولانا مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر ہم خلوص اور عقیدت کی ایک معمولی سی پیشکش لیکر حاضر ہو رہے ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ یہ نمبر اپنی موجودہ صورت میں کس حیثیت اور کس وزن کا حامل ہے یہ کہنا ہمارے خیال میں خود ستائی ہرگز نہیں ہے کہ باوجود کم ضخامت اور بہت سی دوسری خامیوں کے اس میں اس بات کا ضرور لحاظ رکھا گیا ہے کہ مولانا کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر معیاری مضامین اکٹھا کر دیئے جائیں تاکہ کوئی گوشہ روپوش اور مستور نہ رہنے پائے۔ کون نہیں جانتا کہ مولانا کی شخصیت حیرت انگیز طور پر مختلف اور متعدد خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اور ان میں سے ہر خانہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مکمل شخصیت کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نمبر میں آپ مولانا کو بحیثیت شاعر، بحیثیت افسانہ نگار، بحیثیت مدبر اور نکتہ رس سیاست داں، بحیثیت خطیب و مقرر، بحیثیت مکتوب نگار اور بحیثیت صاحب طرز اور منفرد الاسلوب انشا پرداز، بحیثیت ایک کامیاب اور زمانہ شناس جرنلسٹ اور بحیثیت ایک باشعور محقق اور ناقد کے دیکھیں گے۔ اگرچہ یہ تمام گوشے پوری جامعیت اور اکملیت کے ساتھ روشن نہیں ہو پائے ہیں، تاہم تھوڑا بہت مصالحہ ہر پہلو اور ہر موضوع پر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا کی آخری خود نوشت سوانح حیات جو حال ہی میں "انڈیا ونس فریڈم" کے نام سے انگریزی میں شائع ہوئی ہے، اس پر ایک طویل تبصرہ اس نمبر میں شامل ہے۔ جس سے اردو داں طبقہ کو مولانا اور کانگریس کے دوسرے اکابرین کی زندگی کے وہ رموز و نکات معلوم ہوں گے، جو کئی اعتبار سے نہایت اہم اور حیرت انگیز ہیں۔

بہر حال یہ نمبر جیسا کچھ بھی ہے آپ کے سامنے ہے، اور اس کے سوا اور کہا ہی کیا جا سکتا ہے۔

زبان ز نطق فرو ماند، راز من باقی ست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی ست

یوسف (جامعی)

پنڈت جواہر لال نہرو

"آزاد" ـــــ ایک رفیق کار

کسی آشنا ہستی کے متعلق کچھ اظہار خیال کرنا ایک مشکل کام ہے اور یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب وہ ہستی ایسی سیاسی رفیق ہو کہ قومی کاموں کی تمام قسم کی ذمہ داریوں اور تکالیف میں ساتھی رہی ہو، یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق قلم اٹھانا میرے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے تقریباً تیس سال ہوئے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی۔ لیکن مولانا کی علمیت قومی کاموں میں عزم وثبات اور جنگ عظیم کے دوران میں ان کی نظربندی کے متعلق میں اس سے پیشتر ہی بہت کچھ سن چکا تھا، اور ان سے ملنے کیلئے بیتاب تھا۔ عمر کے اعتبار سے ابھی ان کا عالم شباب تھا لیکن ان کے چہرے پر پختہ کاری اور بالغ نظری کے گہرے نقوش تھے اور اس طرح ان کی جگہ بزرگانِ کانگریس میں ناگزیر تھی۔ چونکہ مجھے خود بھی اسوقت کانگریس کے اندرونی حلقوں سے اتنا زیادہ گہرا ربط وضبط نہیں تھا۔ اس لئے اسوقت انہیں دور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا لیکن اس کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں مجھے ان کو بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور بالخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے ان سے بہت گہرا تعلق رہا ہے اگر ہمارے ایّام قید وبند اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے دنوں کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کانگریس کے اندر مشاغل اور اس کی عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں مجھے ان کی حصول رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے۔ کانگریس کی تاریخ میں اور ساری ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کانگریس کی تجاویز اور عزائم کی تلاش وخراش اور وضع قطع میں ان کا زبردست ہاتھ کس طرح مصروف کار رہا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ پریذیڈنٹ ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ایک عام ممبر۔ ان کے آزاد مشورے غیر معمولی طور پر وقیع سمجھے جاتے تھے کیونکہ ان کی رایوں اور مشوروں کے پس پردہ دانش، تدبر، اور فہم وفراست کی غیر معمولی پختگی اور گھلاوٹ روز بروز نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔

مولانا دنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاست داں تھے۔ آپ ایک کامیاب سیاست دان کے طبعی مزاج سے معریٰ تھے جو ٹھوس اور بے حس ہو کر حملے کرنے اور حملے سہنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ کی افتادِ طبیعت سر تا سر اسکے خلاف تھی۔ وہ بیحد شرمیلے اور خلوت پسند تھے اور مزید برآں ان کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل تھا۔ باوجود ایک موثر اور باوقار مقرر ہونے کے شور وشغب اور ہنگامہ خیزیوں سے بہت گھبراتے تھے۔ ان کو عوام میں تقریر کرنے کیلئے آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حق یہ ہے کہ ان کی اصلی خصوصیت علم وفضل تھی۔ حالات کی نزاکت نے انہیں حرکت وگردش کی زندگی پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آجاتے تھے جو انقلاب فرانس سے کچھ پہلے موجود تھے۔ تاریخ اقوام ماضی میں ان کا درک وبصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اور پھر یہ وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط وترتیب کے ساتھ موجود تھا۔ ان کا ذہن مدلل، باضابطہ اور سلجھا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے منطق وفلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔

اگر اسوقت خلوت پسندی اور شرمیلا پن ان کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا، تو وہ ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ کیونکہ ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز تھا، جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت عمل کی طرف راغب کر سکتا تھا۔ ہم نے یہ اعجاز اور آواز پبلک میں بہت کم سنی اور بدقسمتی سے انہوں نے اپنے جادو نگار قلم سے بھی پہلے کی طرح دل آویزیاں اور رنگینیاں پیدا کرنی چھوڑ دی تھیں۔

مجھے ہمیشہ ان کی تصنیفی زندگی سے بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے کیونکہ جو رمان وہ لکھتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ پُرمعنی الفاظ سے مملو ہوتی تھی شاب میں ہی انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا عربی ممالک اور مصر سے خراج تحسین وصول کر لیا تھا۔ اور وہ محض ان کے قلم کی بدولت تھا۔ اور ابتک یہ حالت تھی کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیاح ہندوستان سے جاتا ہے تو اس سے ابوالکلام کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے اگر انہوں نے اپنا یہ جہاد قلمی جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرز فکر اور

شاہراہ

"علم و نظر کی راہوں میں آجکل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، مگر میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور جو کچھ جدید ہے، اس کے لئے میں نے اپنی راہیں خود نکال لیں۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں، جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا ہوں، خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالہ کیا تھا میں نے اول روز ہی سے اس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی روک نہ ہو سکیں۔ اور تحقیق کی تشنگی نے کسی گوشے میں بھی ساتھ نہ چھوڑا — میرے لئے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پئے ہیں، اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفا میں آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں، اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا چشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا"

(ابو الکلام آزاد)

قاضی عبدالغفار

مولانا کی نفسیات ان کے ادب کے آئینہ میں

مولانا کے آرٹ کی خصوصیات سے ان کی نفسیات کا موازنہ کرنا اور ان دونوں کے درمیان صحیح توازن قائم رکھنا آسان آسان نہیں علاوہ بریں یہ کوشش اپنی قسم کی واحد کوشش ہے۔ اور شاید اُردو ادب میں تو یہ پہلا ہی تجربہ ہے جس کے نتائج کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اس تمام تجربہ کے دوران میں مولانا کے ادب کی بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھا ہو گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جس طرح غالب نے اپنی نظم میں اسی طرح مولانا نے اپنی نثر میں کسی دوسرے اسلوب نگارش کی تقلید کو گناہ سمجھا ہے۔ یہ کوئی مصنوعی انداز تفاخر نہیں ہے بلکہ ایک قدرتی انفرادیت ہے کہ اس میں نہ تو کوئی دوسرا ادیب مولانا کا شریک ہو سکتا ہے اور نہ ان کی انفرادیت اور ان کے آرٹ کو اپنا سکتا ہے۔ مولانا کا ادبی اجتہاد نقل اور تقلید کی دسترس سے دور ہے اگر اس طرح نگاری میں تصنع ہوتا، تو ہر کوئی اس کی نقل کر سکتا لیکن چونکہ یہ فطرت کا اپنا آرٹ ہے اس لیے اس کے نقش و نگار نے نکال قلم سے کاغذ تک آتے ہیں اور فکر و نظر کے جواہر بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ گذشتہ تیس سال میں میری نظر کے سامنے سیکڑوں اہل قلم نے مولانا کے اسلوب کی نقالی کرنی چاہی لیکن کوئی بھی اس تقلید میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لہٰذا مولانا کی تحریروں کا دوسرے ادیبوں کے اسلوب بیان سے موازنہ کرنا تو خارج از بحث ہے۔ ان کے آرٹ کا طبعاً بہت غیور اور مغرور ہے۔ اور اپنی انفرادیت میں شرک کو گوارا نہیں کرتا۔ "غبار خاطر" کے مختصر سے خط میں خود ہی اس طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

سحر شوق نہ شیرازہ نہ گنجد نہ
مگذ ار بہر کہ این نسخہ مجزا ماندا

مولانا کے ادب کی بنیادی خصوصیت کو سمجھنے کے لیے ناظرین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ خود مولانا نے اپنے ادب کی فطرت کے بعض حقائق کو بے تکلف بے نقاب کر دیا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مولانا کے طرز نگارش اور طرز فکر کے متعلق اپنے مقصد کے تحت کوئی علمی اصطلاح وضع کروں اب خود دیکھتا ہوں تو مولانا نے خود ہی "غبار خاطر" کے اوراق پر اسے آرٹ کے مساوی عناصر کی نشان دہی فرما دی ہے وہ "انانیتی ادب" (Egoistic Literature) کی اصطلاح میں اپنے ادب کی فطرت کو نامزد فرماتے ہیں ایک پورا مکتوب اسی موضوع پر حاوی ہے جس میں وہ اپنے ادب کی فطرت کے اس تقاضے کو بہت ہی حسین پیرائے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ہماری درماندگیوں کا عجب حال ہے ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچا لے جا سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے نہیں بچا سکتے ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی ہم جہاں جاتے ہیں ہمارا سایہ ہمارے ساتھ جاتا ہے ایک ادیب ایک شاعر ایک مصور ایک اہل قلم کی "انانیت" کیا ہے؟ ابھی نہ تو فلسفہ و اخلاق کے مذہب "انا" کا رخ کیجئے نہ خودی مصطلحہ تصوف میں جائیے صرف ایک عام تحلیلی زاویہ نگاہ سے معاملہ کو دیکھیے، آپ کو دکھائی دے گا کہ یہ "انانیت" دراصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا"

اس "انانیت" میں ضرورت سے زیادہ رنگ آمیزی کے نقائص کا تجزیہ فرماتے ہوئے مولانا خود اسی "انانیت" کے ردعمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں

"اس مشکل سے صرف حال حال ہی مصنف عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اور ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی انانیت کو بغیر کسی نمائشی وضع میں سجائے دوسروں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے سامنے ان کی انانیت آئی، مگر اس طرح آئی، جیسے کوئی ایک بے تکلف آدمی بغیر کسی وضع بنائے سامنے آ کھڑا ہو۔ یہ بات کہ آدمی بغیر کسی بناوٹ کے اپنی واقعی صورت میں سامنے آ گیا۔ خود حقیقت بھی ایک خاص دلکشی رکھتی ہے اور اس لیے دنیا کی نگاہوں کو بے اختیار اپنی طرف

بنا بریں صحیح راہِ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی۔

یہ محض حالات کا تقاضہ تھا، کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر لینے کیلئے مجبور ہوگئے اور اب یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ انہوں نے یہ سب کچھ بوجوہ احسن ادا کیا۔ لیکن ہم، جنہوں نے ان کو سب زیادہ قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل کی ہے۔ تاریخ کے فیصلہ کے لئے زحمت کش انتظار کیوں ہوں؟ وہ ہمارے لئے اور ملک و قوم کے لئے قوتوں کا ایک محکم پہاڑ تھے۔ قطع نظر اس کے کہ کبھی ہم نے ان کی رائے سے اختلاف کیا یا لااتفاق ہمیشہ یہ بات ملحوظ خاطر رکھے رہے، کہ ان کی رائے ہمیشہ بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب دماغ کی پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی و حال کے علم و فضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہو۔ اور یہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں۔

بڑے آدمی پیدا ہوتے آئے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن مولانا حس خاص نوعیت کی عظمت کے مالک تھے، وہ بھارت یا کسی اور جگہ نظر نہ آسکے گی۔ مولانا آزاد نے اسلام کی سب سے بڑی خدمت کی جبکہ انہوں نے یہ کہا کہ اسلامی ممالک امپیریلزم کے نتیجہ سے تبھی بچائے جا سکتے ہیں جب بھارت آزاد ہوگا۔ مولانا ماضی کی عظمت اور حال کی عظمت کا دل پسند مجموعہ تھے وہ پرانے زمانے کی عظمتیں، خصلتیں مثلاً رواداری، شفقت، مروت، تحمل مزاجی بدرجہ اتم رکھتے تھے۔

آج انسان چاند تک پہنچنے کا متمنی ہے۔ لیکن ہم میں تحمل مزاجی، مروت اور رواداری کا زبردست فقدان ہے۔ مولانا اس کلچر کے نمائندہ تھے، جو مختلف کلچروں کے آپس میں سموئے جانے سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ مولانا آزاد روشن فہم و فراست کے مالک تھے اور مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی حیران کن صلاحیت رکھتے تھے۔ ایسے دوست، رفیق کار، ساتھی، لیڈر اور معلم کی وفات یقیناً گہرا خلا پیدا کر دیتی ہے۔ جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے پھر بھی میں کہوں گا کہ مولانا ہم سے جدا ہوگئے ہیں لیکن ان کا پیغام زندہ ہے اور ماضی کی طرح ہمیں روشنی دیتا رہے گا —

(انگریزی سے ترجمہ)

"دور بینی و مآل اندیشی ایک ایسا وصف ہے جو انسانوں کو مختلف شکلوں میں اپنے مفید نتائج اور بخششوں سے نوازتا ہے۔ کسی کو اس کی بدولت ظاہری قوت نصیب ہوتی ہے، تو کسی کو عقل و فہم کی گہرائی۔ کسی کو اس سے اثر و نفوذ حاصل ہوتا ہے، تو کسی کو ہر دلعزیزی اور شہرت دوام — مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یہ تمام ثمرات و نتائج کسی ایک ہی انسان کو نصیب ہوں۔ مولانا آزاد مرحوم خوش نصیب تھے، کہ دور بینی کی صلاحیت اور مآل اندیشی کے جوہر نے ان کو وہ تمام خلعتیں یکجا عطا کیں جن کی آرزو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ وہ بھی اس خوبی کے ساتھ کہ ان کا تنوع اور بوقلمونی عام انسانی ادراک و فہم کے لئے باعث صد حیرت و استعجاب تھا۔"

(ہمایوں کبیر)

پیدا کرتے ہیں، شروع تو اس طرح کرتے ہیں کہ ـــــ

"قید خانہ سے باہر کی دنیا کے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے۔ اور مستقل پردہ غیب میں مستور تھا کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ سکیں گے، نہیں تاہم ذوق مخاطبت کی طلب کا ریاں کچھ اس طرح دل دردمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھا لیتا تو جی پر رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

اور اس ذوق نگارش کا بیان ختم اس انداز سے کرتے ہیں کہ ـــــ

"لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا، کبھی نامہ کبوتر سے ہمارے حصہ میں عنقا آیا"

بات تو سیدھی سادھی ہے اور کہنا صرف یہی ہے کہ یہ مکتوبات اس یقین کے ساتھ نہیں لکھے گئے تھے کہ وہ کبھی مکتوب الیہ تک پہنچ سکیں گے لیکن ادیب نے اس معمولی بات میں بھی اپنے انداز نگارش کے لئے امتیاز کا ایک پہلو پیدا کر لیا یہ کوئی سخن گسترانہ بات نہیں بلکہ حقیقتاً مولانا کے افکار کی اسی "انانیت" اور "انفرادیت" کا ایک عکس ہے جو ہر بات نرالی اٹھا کر کہتی ہے کہ اس بات کو یوں نہ کہو جیسے عوام کہتے ہیں اپنی زندگی کے ایک غم ناک موقع کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اپنی خودداری، پندار اور اپنے غیور مزاج کی کیفیت کا ایک پہلو اس طرح واضح کیا ہے کہ جس وقت ان کی اہلیہ کی آخری علالت کی تشویشناک خبریں آ رہی تھیں تو وہ یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ ان کی تشویش اور فکرمندی قید خانہ کے ساتھیوں پر ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ اپنی اس کمزوری کو اپنے معنوی وجود کی حدوں سے باہر نکلنے کی کبھی انہوں نے اجازت نہ دی۔ اس کو پرایوں کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ اس پر ظاہرداری کے پردے ڈالتے تھے۔ جس مکتوب میں دبے ہوئے سوز و گداز کے ساتھ اپنی اہلیہ کی علالت اور وفات کا ذکر کرتے ہیں اسی میں اپنے مغرورانہ تحمل کا بھی اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں کہ ـــــ

"جیلر جب بھی کوئی تار لے کر میرے کمرے میں آتا ہے تو اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ شروع ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی لیکن پھر بھی فوراً چونک اٹھتا مرے ہوئے کی پیٹھ دروازہ کی طرف کر لیتی اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کر سامنے نہ کھڑا ہو جائے۔ میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا تھا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے۔ اور پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتا کہ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں میں اعتراف کرتا ہوں کہ ساری ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا ایک مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و قرار پہ بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے ـــــ بالآخر وہ اپریل کو رخصت ہوگئی اور ہر شام کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا"

اس تمام سوز و گداز میں جس کی آواز کو مولانا بند کرتے ہیں۔ ان کے دماغ کا مغرورانہ احساس بالکل عریاں ہے انفرادیت کے اس غرور نے زہر غم کے پیالے کا اتنا ذکر بھی شاید صرف اس لئے گوارا کیا کہ مولانا جانتے تھے کہ یہ مکتوب مکتوب الیہ تک پہنچنے والا نہیں۔ مولانا تسلیم کرتے ہیں کہ اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لئے جیسے وہ انفرادی وقار کے لئے تو ہیں آمیز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مسکراتی ہوئی ظاہرداریاں بھی اپنے لئے جائز سمجھیں۔

دماغ کے اس خوددارانہ احساس کو مولانا نے ان مکاتیب اور اپنی دوسری تحریروں میں بھی بار بار مختلف انداز سے ظاہر کیا ہے۔ اور اس طرح اپنی فطرت کی اس خصوصیت کے خدوخال کو بے نقاب کر دیا ہے کم آمیزی، خودرفتگی اور خودشناسی اور "انانیت" خود انہیں کے الفاظ میں جو انہوں نے جا بجا اپنی ذہنی زندگی کی مخصوص افتاد کے لئے استعمال کئے ہیں یہ مولانا کی زندگی کے ایسے عناصر ہیں کہ اگر ان کی حقیقت کو نہ سمجھا جائے تو مولانا کی زندگی کے کسی ایک گوشے سے بھی واقف ہونا مشکل ہے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ ـــــ

"یہاں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے ہیں جنہیں انوطالب کلیم نے دو مصرعوں میں بتا دیا ہے

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے

یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گرفت

پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسی طبیعت ہی نہیں لایا۔ ناچار دوسرا اختیار کرنا پڑا۔

کارِ مشکل بود بر خویش آساں کردہ ام"

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں ـــــ

"انسان اپنی زندگی کے اندر کئی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک

کھینچ لیتی ہے جو خاص خاص ادیب ایسا کر سکے ان کی "میں" خود ان کے لئے کتنی ہی بڑی اور دوسروں کے لئے کتنی ہی چھوٹی و حقیر ہوئی ہو لیکن دنیا اس کی دلپذیری سے انکار نہ کر سکی دنیا کو ان کی "انانیت" کی مقدار ناپنے کی مہلت ہی نہ مل سکی وہ تو اس کی بے تکلفانہ واقعیت کو دیکھ کر بے خود ہو گئی۔"

ادیبوں اور شاعروں اور فنکاروں کی انانیت کے مختلف مظاہر کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا اس "مظاہرۂ انانیت" کے بیش و کم سے اس طرح بحث کرتے ہیں کہ ——

"لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان کے تمام معنوی محسوسات کی طرح اس کی انفرادیت کی نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے کبھی وہ سوتی رہتی ہے، کبھی جاگ اٹھتی ہے، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور پھر کبھی زور و شور سے اچھلنے لگتی ہے انسان کی ساری قوتوں کی طرح وہ بھی، نشو و نما کی محتاج ہوئی، جس طرح ہر انسان کا ذہن و ادراک یکساں درجہ کا نہیں ہوتا۔ اسی طرح انفرادیت بھی ہر ایک میں ایک ہی طرح نہیں ابھرتی۔ مدارج کا یہی فرق ہے جو ہم تمام ادیبوں، شاعروں، مصوروں اور موسیقی نوازوں میں پاتے ہیں اکثروں کی انفرادیت بولتی ہے، مگر دھیمے سروں میں بولتی ہے بعضوں کی انفرادیت اسقدر پرجوش ہوتی ہے، کہ جب کبھی بولے گی تو سارا گرد و پیش گونج اٹھے گا:"

"یکبار نالہ کردہ ام از درد اشتیاق ——
از شش جہت ہنوز صدائی تواں شنید"

اب اس سوال کو کہ مولانا کی انفرادیت کا مقام ان اکثروں سے قریب ہے جن کی "انانیت" دھیمے سروں میں بولتی ہے یا ان بعضوں سے قریب ہے جو جب کبھی بولتے ہیں تو سارا گرد و پیش گونج اٹھتا ہے۔ مولانا کے ادب کا گہرا مطالعہ ہی طے کر سکتا ہے ہم نے تو مولانا کے ادب میں یہ دونوں کیفیتیں دیکھی ہیں۔ اس جمال کے ساتھ جلال کی شان وہی ہے کہ مولانا کے ہر لفظ سے سارا گرد و پیش گونج اٹھتا ہے، ان بعضوں کا ذکر کرتے ہوئے جو زیادہ پرجوش انفرادیت رکھتے ہیں مولانا نے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ ——

"ایسے افراد اپنی "میں" کا جوش کسی طرح دبا نہیں سکتے۔ ان کی خاموشی بھی چیخنے والی اور ان کا لکھنا بھی پرشور ہوتا ہے۔ ایسے افراد جب کبھی "میں" بولتے ہیں تو اس میں قصداً بناوٹ اور نمائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا وہ سراپا حقیقت حال ہی کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہوتی ہے ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیار نظر سے دور رکھنا پڑے گا ایسے لوگ فکر و نظر کی عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے ادب و تصنیف کے عام قوانین انہیں اپنے کلیوں سے نہیں پکڑ سکتے زمانہ کو ان کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں ان کی ہر "میں" ان کی ہر "وہ" اور "تم" سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔"

"انانیتی ادب" کے اخص الخواص کیسے افراد ہوتے ہیں۔ جن کا ادب عام ترازو میں نہیں تولا جا سکتا ہے۔ اور جن کو ادب و تصنیف کے عام کلیات پکڑ نہیں سکتے۔ اور جن کی "میں" ہزار "وہ" اور "تم" سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔ اس اشارے کو مولانا کا ادب سامنے رکھ کر سمجھ لینا کچھ ایسا دشوار نہیں، ہم یہ جان لیں تو پھر ہمیں یہ بات بھی مان لینا ہوگا کہ مولانا نے خود اپنے اسلوب نگارش اور طرز فکر کے تجزیہ کا یہ ایک معیار ہمیں بتا دیا ہے۔

مگر اس "انفرادیت" اور "انانیت" کے بے پناہ اقتدار کو تسلیم کر کے آگے بڑھیں تو مولانا کی نفسیات کے پیمانہ میں ان کے ادب کو ماپنے اور تولنے کے بہت سے ڈھنگ معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں ان کی تحریروں میں اور خصوصاً "غبار خاطر" کے مکتوبات میں مولانا کی نفسیات کا جو نقشہ ابھرتا ہے، اس میں سب سے نمایاں خانہ وہ ہے جہاں ہم خود مولانا کے قلم سے ان کی فطرت کی تصویریں متحرک پاتے ہیں۔ اس خانے میں مولانا کی جو ذہنی کیفیت نمایاں ہوتی ہے اس کے بہت سے نام رکھے جا سکتے ہیں خودداری، انانیت، انفرادیت، کم آمیزی، اور احساس برتری تو عقلیت (Intellectual) کا ایک طبقاتی امتیاز ہے۔ یہ طبقہ اپنے کو عمومیت سے جدا رکھتا ہے اور ہر معمولی واقعہ میں بھی اپنے لئے امتیاز خاص کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتا ہے مگر شہد کی محتاط مکھی کی طرح پھول کے سوا کسی چیز کو مس کرنا بھی اپنے لئے وجہ آسودگی سمجھتا ہے۔ وہ اپنے بلند اور مخصوص مقام پر کسی ایسی عمومیت کو خواہ وہ قلم اور زبان ہی کی ہو، پسند نہیں کرتا، جو اس کی ہم عمر "عقلیت" کے سانچے میں نہ ڈھل سکے، اور اس کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکے۔ مولانا اپنے ایک مکتوب میں اپنے ذوق نگارش کا ذکر کرتے ہوئے، اپنی قید کی پابندیوں میں بھی اپنے لئے ایک امتیاز

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

جب کبھی میں قید خانے میں سوچا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی آدمی کے لئے سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا اس کو سزا کہتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لئے حاصل کی جا سکیں "

اپنی طبیعت کے اس سانچے کے نوع استحکام کے متعلق مولانا اعتراف کرتے ہیں کہ اب یہ سانچہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے توڑا تو جا سکتا ہے مگر موڑا نہیں جا سکتا بلکہ مولانا کو وہ ادب کی سرحد پر کھڑے ہو کر بیٹھنے والے تو اب یہاں تک لے آیا ہے کہ یہ سانچہ تو اب نہ توڑا جا سکتا ہے نہ موڑا جا سکتا ہے۔ اس باب میں مولانا عوام کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی رد سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ خود ہی فرماتے ہیں ——

"اس افتاد طبیعت کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہا ہوں۔ اور لوگوں کو حقیقت حال سمجھا نہیں سکا۔ لوگ اس حالت کو غرور اور پندار پر محمول کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں کو کمتر تصور کرتا ہوں اس لئے ان کی طرف بڑھتا نہیں۔ حالانکہ مجھے خود اپنا بوجھ اٹھنے نہیں دیتا۔ دوسروں کی فکر میں کہاں رہ سکتا ہوں علی کشمیری نے ایک شعر کیا خوب کہا ہے

طاقت بر خاستن از گرد غم کم ماندہ است
خلق پندارد کہ مے خوردست و مست افتادہ است"

اسی وجہ کو مولانا عوام کی عمومیت سے استغنا، دوری، بُعد اور اجنبی قرار دیتے ہیں کہ وقت کے تقاضوں کی تعمیل جس پر وہ اپنے قول کے مطابق کبھی کبھی بادل ناخواستہ رضامند ہو جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی فطرت سے متصادم ہوتی ہے۔ غبار خاطر کے مکتوبات میں وہ بار بار پڑھنے والے کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کی اور عوام کی زندگی کے درمیان کوئی بنیادی حقیقت مشترک نہیں ہے۔ مثلاً ——

"طبیعت کی بے میل افتاد کسی کے ساتھ نہ لگ سکی کسی وقت اور رسم کے پیچھے نہ چل سکی اسے جمود کا نقص کہئے لیکن یہ ایک ایسا نقص تھا، جو اول روز سے طبیعت اپنے ساتھ لائی تھی۔ زمانہ جو قدرتی طور پر موسمی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے، اس عادت کے پیچھے میں کہاں لگ سکتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں تو مرتے نہیں ملتے تاہم اس نے مرگی پر بھی اپنی قیمت ہمیشہ گراں رکھی۔ لوگ چاہتے ہیں کہ مرنا بیچیں یا نہ ملے مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی

متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی

جس جنس کی بھی عام مانگ ہوتی ہے (ویسی ہی) دوکانیں جگہ پا سکیں۔ لوگ بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈ کر لائیں گے جس کا رواج عام ہو اوروں کے لئے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی وہی میرے لئے ترک و اعراض کی علت بن گئی انہوں نے دوکانوں میں ایسا سامان سجایا جس کے لئے سب کے ہاتھ بڑھیں، میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں لوگ بازاروں میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں، جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی، تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی، جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے۔ مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا ——"

اس موقع پر مولانا کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ "تذکرہ" کے ناشر ماسٹر فضل الدین صاحب کے قلم سے نقل کرتا ہوں۔ یہ فضل الدین صاحب ایک زمانہ میں مولانا کے معتمد اور ان کے صحافتی کاروبار کے مہتمم بھی تھے۔ "تذکرہ" کے ساتھ انہوں نے چاہا کہ مولانا کی ایک تصویر بھی شائع ہو۔ لیکن مولانا نے اس تجویز کو ناپسند فرمایا۔ اس واقعہ کی نسبت ماسٹر فضل الدین صاحب اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ ——

"الہلال میں دنیا جہاں کی تصویریں نکلتی رہیں مگر لوگوں کے سخت اصرار پر بھی انہوں نے اپنا فوٹو شائع نہیں کیا "انجمن اعانت نظر بندان دہلی" نے بار بار ان سے فوٹو طلب کیا مگر انہوں نے نہ بھیجا۔ سید فضل الرحمن نے اخبار "جمہور" کلکتہ میں ان کے فوٹو کا اعلان شائع کیا تھا اس پر وہ سخت برہم ہوئے، اور بڑا ہی سخت خط ان کو لکھا پھر مجھے

قید حیات کے ماہر کی ایک اندر کی —— قید کی ماہر کی زندگی میں ہیں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنے فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی حسن آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجبور ہو کر کبھی کسی کے یار شاطر نہیں ہوں لیکن بار خاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں"

پھر ایک مقام پر فرماتے ہیں ——

"انسان کا اصل عیش دماغ کا عیش ہے جسم کا نہیں ہے۔ میں لذت سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں جسم ان کے لئے چھوڑ دیتا ہوں —— اور غور کیجئے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ سر و سامان کا رہنا اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔"

مولانا نے بار بار اور پوری صراحت کے ساتھ اپنی کم آمیزی اور خلوت پسندی، رسم و راہ عام سے بیزاری کا ذکر کیا ہے۔ ان فرمودات کو پڑھنے والے کے دل میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ مولانا کی فطرت عوامی زندگی کے تمام راستوں سے الگ اپنا راستہ بناتی ہے اور یقیناً عوامی زندگی سے وہ اتصال جو انہیں سیاسی اغراض کے تحت قائم رکھنا پڑتا ہے ان کی طبیعت پر گراں گذرتا ہوگا۔ حالت تو یہ ہے کہ سونے جاگنے اور کھانے پینے میں بھی ان کا مسلک تقلید نہیں بلکہ اجتہاد ہے مثلاً اپنے سونے اور جاگنے کے اوقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ——

"سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصہ میں آئی۔ دنیا کے سونے کا جو وقت ہے وہی میرے لئے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اسی لئے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت اندوز ہوتا رہوں ——"

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من
ایں عجب کاں دم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی حرکتوں کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے میں سو رہا ہوتا ہوں، جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں"

جلوت سے یہ بیزاری اور خلوت سے یہ لگاؤ وہ فرماتے ہیں کہ عادتوں کی طرح پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ فطری ہے ——

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتے اس لئے بے تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کام جوئیوں میں لگ گئی۔"

جو لوگ مولانا کو کسی قدر قریب سے دیکھ سکے ہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ اب اس "طبع وحشت سرشت" کی اس سرشت میں بہت اضافہ ہو چکا ہے کیونکہ اب زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے بھی بسا اوقات خلوت کی کام جوئیوں پر حاوی نہیں ہو سکتے بلکہ اب تو طبیعت کی اس افتاد نے مولانا کو پہلے سے بہت زیادہ خلوت کی محفل آرائیوں کا خوگر بنا دیا تھا اور اس افتاد سے ایک استغراق کی حالت میں منتقل ہو کر وہ اب زیادہ مطمئن ہو گئے تھے

"طبیعت کی اس افتاد نے بڑا کام یہ کیا کہ زمانہ کے بہت سے حربے میرے لئے بیکار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رخ پھیر لیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور منت گذار ہونے لگتا ہے کیونکہ جو ہجوم لوگوں کو خوش کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے میں اگر عوام کا ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی بات نہیں ہوتی اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب کی شاعری کے ساتھ ہوا تھا

فراوانی اور سجان اللہ بخشش و لطف غیبی کی بے پایانی۔"

ایک دن ترقی پسند ادیبوں کی ایک صحبت میں مولانا کی نفسیات پر گفتگو ہو رہی تھی ماہرین میں سے ایک صاحب نے یہ اصول پیش کیا کہ نفسیات کا مطالعہ جنسی زندگی کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ دیر تک اس نظریہ پر بحث ہوتی رہی اور میں تو شروع ہی سے اس بات کا قائل ہوں کہ زندگی کا جنسی پہلو سوانح نگار کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے بغیر اس کے زندگی کا جذباتی رخ روشنی میں نہیں آتا۔ اور انسانی کردار کی قوت محرکہ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ میرا گمان تو یہ ہے کہ جس طرح شراب کے نشے کی حالت میں انسان کے اندرونی جذبات اور طبیعت کا پوشیدہ عیب و ثواب باہر آجاتا ہے، اسی طرح عشق مجازی کی طوفانی کیفیت بھی شخصی سیرت کے حقائق کو پردے کے باہر لے آتی ہے۔ مولانا اگر اپنے عشق مجازی کے ' ، اشارے سے ایک قدم بھی آگے بڑھتے تو مجھے انکی نفسیات کے مطالعہ کا ایک بہترین میدان ملتا۔ لیکن بہر حال یہ تو صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی انفرادیت عشق مجازی کے طوفان سے بھی سرفراز نکلی۔ اور اس نے ہوس کی راہ کو بھی حقیقت کی طرف موڑ دیا۔ اس عمل میں بھی جسے مولانا لطف غیبی سے منسوب فرماتے ہیں۔ ان کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے۔ درحقیقت "لطف غیبی" اسی انفرادیت اور "انفرادیت" اسی لطف غیبی کا نام ہے۔ ایک موقع پر انہیں صفحات میں جب وہ اپنے عشق مجازی کا ذکر کرتے ہیں تو اپنی عصیانی کیفیت کو اس طرح کھول دیتے ہیں۔

"قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے بہتر ہے کہ
ہم آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں۔"

"غبار خاطر"، "تذکرہ" "الہلال" اور متعدد تحریروں میں ہم نے مولانا کو خود ہی اپنا شاہد بنتے دیکھا ہے اور ان کے تشخص کے اسی "ذاتی" جلوہ میں اور زیادہ ان کی انفرادیت کو پہچانا ہے۔ مولانا اپنی انفرادیت کی کم آمیزی کو اپنے میکدۂ خلوت سے منسوب فرماتے ہیں، انہیں بہت عزیز ہے۔ ان کے لئے زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی۔

"باہر کے سارے سازوسامان عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ (میکدۂ خلوت) نہیں چھنتا میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے۔"

لیکن خلوت پسندیوں کی ان تمام سرمستیوں میں افسردگی اور درد گداز کی بھی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ جس کا ہمیں مولانا کی زندگی کے معیار پر تجزیہ کرنا ہے۔ ایک طرف تو احمد نگر کے قلعہ میں مولانا کا استغنا یہ ہے کہ۔

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود کے باہر تھا۔ اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا، اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیرو نظارہ میں محو رہتا ہوں۔"

لیکن دوسری طرف ہم سوچتے ہیں کہ کیا اسی سیرو نظارہ کی خلوت زندگی کے پیش پا افتادہ حقائق کی کسوٹی پر پوری اتر سکتی ہے۔ کیا عوامی مذاق کے نقطۂ نظر سے ہم سیرو نظارہ کی اس خلوت میں افسردگی، بے عملی در قوت عمل کی شکست کا بھی کوئی پہلو پاتے ہیں؟ مولانا کی ذہنی رفعت اس قسم کی تمام کسوٹیوں سے بے پروا ہے۔ لیکن عوام کے ساتھ مولانا کی پبلک زندگی کے بے روابط تقریباً ۳۵ سال کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور خصوصاً اب جبکہ ہندوستان میں ۴½ کروڑ مسلمانوں کے واحد رہنما مولانا ہی ہیں اور عوام سے مولانا کا یہ تعلق ان کے لٹریچر کا ایک نمایاں جز بن چکا ہے تو پھر عوام کو اپنی استعداد کے مطابق مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر تبصرہ کرنے سے کون روک سکے؟

یکسانی اور تبدیلی کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ ——

"یہاں پانے کا مزہ انہیں کو مل سکتا ہے، جو کھونا جانتے ہیں۔ جنہوں نے کچھ کھویا ہی نہ ہو انہیں کیا معلوم کہ پانے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔"

لیکن جس طرح ذہنی زندگی میں پانے اور کھونے کی اصطلاحیں ایک خاص معنی رکھتی ہیں۔ اسی طرح عوامی زندگی میں بھی سود و زیاں کا حساب ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عوامی زندگی کی جلوت میں جو ایک "عقلیت" سیر و تماشا کی خلوت نہیں ہے۔ کس کا زیاں کس کا سود ہے۔ اور اس جلوت میں جہاں مولانا اکثر با دل ناخواستہ نظر آتے ہیں۔ عوام کے سود میں ان کی بخشش کا حصہ کتنا ہے مولانا اپنی ذہنی زندگی میں اپنے زیاں کو اپنا سود سمجھتے ہیں۔ اور اس معیار کے مطابق ان کا یہ نقطۂ نظر صحیح ہے۔ لیکن عوام جو مولانا کی ذہنی زندگی کی سطح سے بہت نیچے ہیں اپنے سود و زیاں کے تقابل کا مختلف معیار رکھتے ہیں۔ اور اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کی اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی اور وجدانی صلاحیتوں نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس سے بہت زیادہ انہیں ملنا چاہیے تھا۔ کیا ہم مولانا کی نفسیات کے مطالعے

لکھا کہ جس قدر کتابیں انہوں نے تیار کی ہیں میری طرف سے تحریر کر رکھی ہو اور شائع نہ ہوئی ہو۔ جب قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر جمہور ان سے ملنے رانچی گئے تو ان سے بھی وعدہ لیا کہ اخبار میں ایک نوٹ اس مضمون کا درج کرا دیں گے کہ یہ کارروائی مولانا کے علم سے ہوئی۔ مگر انہوں نے درج نہیں کیا[1]۔ ان تمام موقعوں پر سمجھا رہا کہ یہ بات یا تو انکسار طبع کی بنا پر ہے یا ان کی طبیعت کے اس عام خاصہ کا نتیجہ ہے کہ جو بات عام طور پر لوگ کر رہے ہوں اس سے خود پرہیز کرتے ہیں۔"

اس کے بعد فضل الدین صاحب نے لکھا کہ مولانا کی مخالفت تصویر کے متعلق شرعی امتناع کے خیال پر مبنی تھی لیکن وہ اس شرعی امتناع کے خیال سے مطمئن نہ تھے۔

یہ واقعہ ۱۹۱۹ء کا ہے اور گذشتہ تیس سال میں ہندوستان کے دریاؤں میں بہت پانی بہہ گیا ہے اور ہمارے سامنے یہ بحث نہیں کہ تصویر کے متعلق شرعی حکم کیا ہے۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ شریعت کا حکم جو بھی ہو لیکن مولانا کی فطرت کا بھی ایک حکم ہے جس کی طرف مولوی فضل الدین نے اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا ہے۔

خود "تذکرہ" کے بعض دوسرے مقامات پر مولانا نے مذہبی مسائل میں بھی تقلید سے اپنی بیزاری اور اپنے مجتہدانہ طرزِ فکر پر زور دے کر آج سے تیس سال پہلے ہی اپنی خود شناسی اور انفرادیت کو واضح کر دیا تھا۔ تذکرہ کے صفحات پر اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ ——

"جس حال میں رہے نقص اور ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید اور روشِ عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی، اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لئے اپنا نقشِ قدم رہنما چھوڑا —— توفیقِ الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت اور تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔ سب سے زیادہ آسان اور پُر امن راہ یہ ہے کہ رہنمایانِ طریق میں سے کسی صاحبِ ارشاد کی صحبت حاصل ہو جائے۔ لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اس بارے میں میری درماندگی و بے کسی کسی متعارف وسیلۂ ہدایت و ارشاد کی رہینِ منت نہیں ہے۔ حالات جیسے کچھ بھی رہے سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے جن تک بتدریج رسائی میسر آئی۔ قطع نظر اس معاملۂ خاص کے عقائد و اعمال و عادات و خصائل و فکر و نظر و طرز و روش کوئی بات بھی ایسی نہیں کہ جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ میری اپنی شائستگی اور نخستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زمان کی۔ نہ خاندان کی نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی۔ جو کچھ پایا ہے بارگاہ عشق سے پایا ہے جس کی رہنمائیاں مجھے صرف اسی مرشد فیض اور ہادیٔ طریق سے ملیں۔ درد بن کر آیا تھا مگر درماں بن کر گیا۔ مرض بھی وہی تھا شفا بھی اسی سے ملی۔"

"تذکرہ" کی اشاعت سے نو سال پہلے یعنی آج سے تقریباً چالیس سال پہلے مولانا عشق مجازی میں اپنے ایک الجھاؤ کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں مگر اس کی تفصیل بیان نہیں فرماتے تاہم وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسی عشق مجازی نے انہیں خود شناسی کی راہ بتائی۔ اپنی زندگی کے اس واقعہ کو وہ اپنی ذہنی انانیت کی نشو و نما کا ایک نشانِ راہ سمجھتے ہیں۔ تذکرہ کے اوراق پر مجاز سے حقیقت کی طرف اپنی زندگی کے رخ کے بدلنے کی روئیداد ایک عجب وارفتگی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

"اپنی غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا ادھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا —— ناگہاں جاذبۂ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجاز میں نمودار ہوا۔ اور ہوس پرستی کی آوارگیوں سے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ اس سفر کی سب سے اقرب راہ منزلِ مجاز ہی سے ہو کر نکلی۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا۔ پتے پتے کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے —— سب نے نقاب اتار دئے۔ سب پردے تجلی ہو گئے۔ بادل کو پکڑا تو ساز ہستی کا طنبورہ نکلا۔ بجلی کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا ایک تبسم آشکار نکلی۔ ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آ گئے۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں ختم کر دیں۔ مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا۔ ... الحمد للہ دولت سعادت و قبولیت کی

---

[1] مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں۔

کا دیکھ لینا میرے علم کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو۔ اور اگر اگلی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔"

عوام کو متنبہ فرماتے ہیں ـــــ

"آہ، تمہاری غفلت سے کہ آج تک کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی۔ اور تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے۔ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں، اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جائے۔ یہ کیا ہو گیا ہے کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو۔ اور کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے ہو اور سمجھتے ہو۔ پھر تو راست بازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور گمراہوں کے نقش قدم چھوڑتے ہو۔"

یہ سب کچھ مولانا اس زمانے میں فرما رہے تھے۔ جب خلافت کی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور ہر طرف جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ لیکن مولانا مطمئن نہ تھے۔ اسلئے کہ وہ جس پیمانے سے قومی تحریک کو ماپتے تھے وہ ان کے رفیقوں کو اور شرکائے کار کا پیمانہ تھا اس لئے وہ مایوس ہوتے تھے۔ اور اپنی مایوسیوں کو اپنی خطابت کے مخصوص رنگ میں ظاہر فرماتے تھے۔

اس خطبۂ صدارت کے آخری صفحات میں مولانا نے اسی خطابت کے تمام زور کو عوام کے متعلق اپنی مایوسی کے اظہار میں صرف کر دیا ان الفاظ میں مولانا کی فطرت کے بہت سے پہلو نمایاں ہیں۔

"بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ہو۔ اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر (رانچی) کے گوشۂ غربت و عزلت میں چلا گیا۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کن کاموں میں بسر ہوتی رہیں۔ اب میں پھر تم میں واپس آ گیا ہوں۔ لیکن تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں بھی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گہرائی تم میں نظر نہیں آتی، تو تم مجھے جلسہ ہو، کہ استقبال کے بھرے ہوئے اسٹیشنوں پر مجھے

اتارو، اور ایسے پُر جوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتح مند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں، اور پھر تم اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے، مگر آہ۔ میں تمہاری ان بھیڑوں کو لیکر کیا کروں۔ جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے اور تمہارے اس جوش و استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔"

آخری سطروں میں وہ اپنے دل کی پکار کو اس طرح جگہ دیتے ہیں ـــــ

"افسوس تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ساہو، میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جفت خوش حالاں و بد حالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نہ جست اسرار من
سر من از نالۂ من دور نیست
لیک کس را گوش آن منظور نیست

اس کے بعد وہ یاد دلاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے رہے اس سے اکثروں نے اعتراض کیا اور بہتوں نے اس پر استہزا کیا اور بعضوں نے اسے ادیبانہ فسوں گری قرار دیا لیکن پھر رفتہ رفتہ سب اس حقیقت کے قائل ہوتے گئے یہ تو ۱۹۲۰ء کے تاثرات ہیں لیکن آغاز کار کے احساسات کا بھی کم و بیش یہی عالم تھا الہلال ۱۹۱۳ء میں مولانا عوام کو مخاطب کرتے ہیں ـــــ

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں، جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگان خواب موت ہوشیار ہو جائیں ـــ آہ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے۔ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوال امت کے زخموں پر ناز ہے۔ کہاں ہیں وہ جگر آتش غیرت و حمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہوں۔ اور پھر آہ، کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن

میں کوئی ایسی حقیقت پاسکتے ہیں جو مولانا کے فلسفۂ زندگی میں عوام کے لئے ایک حد سے زیادہ کوئی کشش پیدا کرسکی ہو ؟

مولانا کی تحریروں میں جہاں کہیں سوز و گداز کا کوئی پہلو نمایاں ہوگیا ہے (حالانکہ وہ اس پہلو کا زیادہ نمایاں ہونا پسند نہیں فرماتے) — تو پڑھنے والوں کا ذہن اس جستجو کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ کیا علاوہ فطری وجدان قلب کے جو لازماً سوز و گداز پیدا کرتا ہے۔ عملی دنیا کے کچھ اسباب ایسے بھی ہیں جنہوں نے مولانا کے افکار میں مایوسی اور شکست کا ایک عنصر پیدا کردیا ہے۔ ایک مقام پر اپنی ذہنی زندگی کے سوز و گداز کو اس شاعرانہ انداز میں واضح فرماتے ہیں۔

"جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول
چن رہے تھے تو ہمارے حصہ میں تمناؤں اور حسرتوں کے
کانٹے آئے، انہوں نے پھول چن لیئے اور کانٹے چھوڑ دیئے
ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے۔"

پھر اسی کیفیت کی تعلیل ایسے فلسفیانہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں کہ۔

"اس بارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں جو کسی
حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلالِ صافی کا کوئی جام نہیں
بھرا گیا جو دُرد کدورت اپنی تہہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ
کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا اور خندۂ
بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا"

لیکن عوامی زندگی کی پست سطح پر زندگی کے سود و زیاں کا یہ فلسفیانہ اور حکیمانہ تقابل تسکین بخش نہیں ہوتا حقیقت یہ ہے کہ تنہائی، افسردگی اور کم آمیزی اور ذہنی خلوت مولانا کی فطرت کے وہ تمام اجزا ایسے ہیں اگر انکو پیش پا افتادہ اسباب و علل کی کسوٹی پر کسا جائے تو ہم افسردگی اور کم آمیزی کا ایک ایسا پس منظر مولانا کی ذہنی زندگی کے پیچھے دیکھتے ہیں جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا کی عوامی اور سیاسی زندگی کا تمام کاروبار دوسروں کے طرز فکر سے جدا تھا وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار اس حقیقت پر زور دیتے رہے ہیں کہ ان کا راستہ دوسروں سے پہلے بھی الگ تھا اور اب بھی الگ ہے ۱۹۲۰ء میں بنگال کی خلافت کانفرنس میں مولانا نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں اپنی اس ذہنی "غریب الوطنی" کا شکوہ ان لوگوں سے کیا جو انکی راہ پر ان کے ہمسفر نہ ہوسکے فرماتے ہیں ——

"میری طرف دیکھو میں ایک انسان تم میں موجود ہوا ہوں

سالہا سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کرتا رہا۔ میں صرف ایک ہی بات کی طرف تڑپ تڑپ کر پکارتا رہا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہوں تم نے ہمیشہ انکار کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں میں ایک بیگانۂ آشنا غریب الوطن ہوں . باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے مجھے اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و رفیق اور صرف اپنے سایہ ہی پر قانع رہنا پڑا۔ یہ عالم جو اپنے ہر گوشے میں معیتوں اور رفاقتوں کے راحت افزا جلووں سے معمور ہے میرے لئے ہمیشہ ایک سمندر یا صحرائے ریگزار رہا کبھی اس نے ایک آبادی یا بستی کا کام نہیں دیا اور نہ کبھی میں اپنے تئیں اس قابل بنا سکا کہ اس کی رفاقتوں کا ساتھ دے سکوں"

دیگر ہم وطنوں کی حالت کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں کہ ——

"دوسری طرف کام کرنے والوں کی جماعت ہے اور جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں اس پر اب تک وہی تذبذب و اضطراب، اور ضعف و انتشار کا عالم طاری نظر آتا ہے، جو پچھلے دوروں میں طاری رہ چکا ہے اب تک مقاصد سے اعراض ہے اور وسائل میں انہماک اب تک حقیقی مصلحت بینی اور حیلہ جوئی اور بہانہ سازی میں امتیاز کی راہ مسدود ہے اور عزم و یقین کی جگہ ظن و شک اور خوف و ہراس کی حکومت قائم ہے۔ زبانوں کی لکنت دور ہوچکی اور شاید چہروں کا ہراس بھی جاتا رہا لیکن دلوں کی وحشت بدستور باقی ہے اور پاؤں کی کمزوری نے ابتک روحوں کا ساتھ نہیں چھوڑا"

پھر فرماتے ہیں ——

"عمل کے لئے تمہارا رخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو اور میری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بتا چکا ہوں تم بارش کے وجود سے انکار نہیں کرتے لیکن منتظر رہتے ہو کہ پانی سر سے لگ جائے تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی

وماناے کبھی اسا ہی بلکہ اس سے زیادہ کام کیا جو علی برادران کر رہے تھے دوسری قومی تحریکوں میں بھی مولانا ایک ہی میدان میں علی برادران کی اعانت کے ساتھ کام کرتے رہے لیکن افکار اور اصولوں کا معنوی اختلاف سطح کے نیچے بہت مستحکم تھا اس حقیقت سے وہ لوگ خوب واقف ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کی اس جدوجہد کا زمانہ دیکھا ہے اور پھر یہ اختلاف موقت تو بالکل عیاں ہو گیا جب تحریک خلافت کے ختم ہونے اور فرقہ واری کے فتنہ کا سر اٹھنے کے بعد علی برادران مہاتما گاندھی کی قومی تحریک سے جدا ہوئے۔ لیکن مولانا نے اس تحریک کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی جگہ تقریباً تنہا رہ گئے۔ لیکن جو راہ انہوں نے پہلے دن سے اختیار کی تھی اس کے صحیح ہونے کا عقیدہ ان کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی کمزور نہ ہو سکا۔

میری طرح جو لوگ تحریک خلافت کے زمانہ میں مولانا اور مولانا محمد علی دونوں کو قریب سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ذہنی خلیج حائل ہے جس پر کوئی پل نہیں باندھا جا سکتا مولوی ابو سعید بزمی صاحب نے اپنی ایک کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ مولانا محمد علی اکثر مولانا کو "ضدی مولوی" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ مولانا کی ضد کے مسلک ہی میں ان کی شخصیت کا اصلی استحکام نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی اور مولانا کی انفرادیت میں بھی ایک بہت بڑا فرق تھا۔ مولانا محمد علی ایک جمہوری لیڈر تھے۔ اور ایک معمولی لیڈر کی طرح عوام کے دماغوں کا زاویہ ہوا کے رُخ پر قائم کر سکتے تھے۔ مولانا اس مفہوم میں اعزاز کی عمومیت سے تقریباً بیگانہ رہے ان کی انفرادیت کے دائرہ میں سب سے نمایاں عنصر عوام کی مقبولیت نہ تھی۔ بلکہ خود ان کی انفرادیت بجائے خود تھی۔ مولانا محمد علی بسا اوقات اپنے نقاد اور مخالف کو دوست بنانے پر آمادہ ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت انکی صحافت کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا۔ لیکن مولانا بعض اوقات دوسروں کے سر دل پر اپنے استبداد یا تسلط نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا ہی نہیں پسند کرتے تھے کوئی احساس کمتری نہیں بلکہ ایک ایسی ہی مستحکم انفرادیت ہے جو میدان جنگ میں اسلئے نہیں جاتی کہ اسے برابری کا درجہ اختیار کرنا آتا۔

مگر اس "انانیت" میں غم کیسی مایوسی اور تنہائی کی؟ علامیں ہم سکتے ہیں اس کا سبب وہی ایک ہے، جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی کہ مولانا کو اپنی زندگی میں بہت ہی کم ایسے لوگ مل سکے جو انہیں صحیح طور پر سمجھ سکتے لیکن مخالفوں کا ہجوم ہر طرف رہا اول تو ابتدائی دور میں قدامت پرست علما کی بعض جماعتیں بھی مولانا کی وسیع الخیالی سے آزردہ ہوئیں اس کے بعد قومی جدوجہد کے میدان میں مولانا محمد علی کی جماعت سے ذہنی اختلافات رہے، پھر جب تحریک خلافت ختم ہوئی اور علی برادران کی قیادت کا دور ختم ہوا تو محمد علی جناح میدان میں آئے ان کی تحریک کا طرز امتیاز یہ بھی تھا کہ اختلاف رائے کو معاف نہ کیا جائے، مولانا ہمیشہ سب سے زیادہ ان حملوں کی زد پر رہے جو لیگ سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں پر کیے جاتے تھے۔ ان سیاسی تعصبات کے سلسلہ میں جو مولانا کے خلاف لیگی قیادت کے دور میں پھیلائے گئے۔ ان کی تفسیر قرآن بھی ہدف بنائی گئی جو دراصل مولانا کے علم و فضل کا ایک بڑا کارنامہ ہے مولانا نے اس تفسیر میں دوسرے مذاہب اور ان کے بنیادی عقاید کا احترام کرنے کی ضرورت پر بحث کی ہے۔ اور اس بحث پر آیات قرآن کو دلیل لائے ہیں۔ مخالفین نے اس موضوع پر مولانا کے خیالات کو تنقیص و تعریض کا ہدف بنایا اور اعتراضات کے انبار کھڑے کر دیے، حتیٰ کہ ترجمان القرآن کو کانگریسی تفسیر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا کلکتہ میں نماز عیدین کی امامت پر جو ہنگامہ برپا کیا گیا وہ تو ہر شخص کو یاد ہوگا۔ تحریک کانگریس کی تحریک آزادی کے دوران میں خدا اور رسول کا نام لیکر مسلم لیگ کے نظریات کو جاہل مسلمانوں کے دل میں بٹھایا گیا اور ایک خود غرض و ناعاقبت اندیش قیادت سے جہلا کے جذبات کو اتنا گرم کر دیا کہ عقل و فہم کے تمام راستے بند ہو گئے تو اس زمانے میں مولانا کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ بھی سب کو معلوم ہے قائد اعظم نے انہیں "شو بوائے" (SHOW BOY) کا خطاب عطا فرمایا یہ عام مسلمانوں کے اشتعال کو اتنا تیز کیا گیا کہ مولانا کی جان بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ جتنی گالیاں انہیں دی گئیں شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے لیڈر کے حصہ میں آئی ہوں لوگوں نے ہزاروں بہتان ان کی ذات پر باندھے۔ اور یہ سب ایک ایسا امتحان تھا جس سے مولانا اپنی پیشانی پر ایک شکن ڈالے بغیر گذر گئے، لیکن تعجب کیا ہے اگر انسانی احساسات اس سب و شتم سے مجروح ہوئے ہوں اور آپ نے اس کی فطرت انکی انفرادیت کے پوشیدہ مرکز میں سمٹ کر پہلے سے زیادہ گوشہ نشین ہو گئی ہو علاوہ ازیں۔ مولانا کی زندگی کے اس دور میں بھی جو سب سے زیادہ مصروفیت اور تعمیری دور تھا مولانا کو اپنے رفقا میں سے صرف دو ہی تین رفیق مل سکے۔ میں غور کرتا ہوں تو دو تین سے زیادہ ایسے نام نہیں بتا سکتا مثلاً گذرے ہوئے

ے ماتم گسار۔ اس برباد شدہ قافلے کے نالہ ساز اس صنف مانندے فغاں سنج اور اس کشتی طوفاں کے مایوس مسافر جنکی موت و حیات ۔ آخر، لمحے جا رہے گذر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش، روتے ہیں یا مایوسی سے چپ ورا مت نگراں مگر ان کے ہاتھوں میں اضطراب ہے، نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام نہ ارادوں میں عمل کا ولولہ دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہل شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے قفل توڑ دئے ہیں اور گھر والے سوتے ہیں۔"

الہلال کی اشاعت کے ایک افتتاحیہ میں فرماتے ہیں کہ ـــ

"افسوس اس دور ہوش و خرد پر، اور بیداری و ہشیاری میں بھی دیکھتا ہوں تو میرے دل کی غمگینی و اضطراب کا علاج نہیں۔ نظر نہیں آتا میں دیکھتا ہوں یا تو غفلت کی سرشاریاں ہیں یا اگر بیداری کی کروٹیں بھی لی ہیں تو آنکھ سے غفلت دوشیں کا خمار ابھی دور نہیں ہوا ہے۔ خواب غفلت کی سرشاری اور چشم نیم باز کی کروٹیں ـ تو دو پہلی حالتیں ہیں لیکن اس کے بعد ایک تیسرا گروہ بھی نظر آتا ہے جو بستر سے تو اٹھ چکا ہے مگر میری مقصود کے حالات سے بے خبر ہے۔"

مجھے تو اردو ادب میں کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے مازیانے عوام کی ذہنیت پر برسائے ہوں۔ یا جس کے انکار کے پیمانے میں عوام کا جمود اسقدر مایوس کن ثابت ہوا ہو۔ یا جس کا احساس عوام کے جمود سے اسقدر زیادہ مجروح ہوا ہو۔ جذبہ صادق کے ان مظاہروں کی وجہ سے، بظاہر نہیں لیکن مولانا کی مایوسیوں کا ایک اور سبب بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ امام کا ممبر مقتدیوں کی سطح سے بہت اونچا ہے ادیب و خطیب نے جس اونچے مینار پر کھڑے ہو کر نیچے میدان کے اس ہجوم پر نظر کی ہے اس کے اور بلندی کی وجہ سے بہت چھوٹے نظر آئے اور یہ بلندی عوام کے افکار کی پستی تک نہ پہنچ سکی، اور پہنچ بھی نہ سکتی تھی اس طرح سے گمان بھی کسی وجہ سے حقائق سے غیر متوازن نہیں کہ مولانا کی انفرادیت اور جیسا کہ جی بی ایس (Genaus) کا تعلق ہے انہیں عوامی زندگی سے زیادہ قریب نہیں ہونے دیا ان کی ذہنی

اور وجدانی خلوت خانہ کے دروازے عوام کے لئے کبھی پوری طرح نہ کھل سکے مختصر یہ کہ جیسے جیسے مولانا "جی بی ایس" کا دائرہ منتشر ہے وہ اور ان کی زبان اور ان کے قلم سے ایک غمگین راگ بن کر نکلتی ہے۔

نفسیات کی اس بحث کا ایک پہلو اور بھی ہے بار بار مولانا اس بات کا شکوہ کرتے رہے ہے کہ ان کے رفیقوں اور ہم کاروں نے صحیح راہ عمل جس کی طرف وہ دعوت دیتے رہے اختیار نہیں کی یہ بحث اسوقت ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ وہ راہ عمل کیا تھی۔ جو مولانا پیش کر رہے تھے لیکن سر سبیل تذکرہ اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حد تک مولانا نے جو راستہ انہیں مثلا اس کو مسلمانوں نے اختیار نہیں کیا اور بالآخر اس کے ہولناک نتائج انہیں برداشت کرنے پڑے۔ تب ہی دنیا نے سمجھا کہ مولانا صحیح راستہ دکھا رہے تھے اور ہندوستان کے مسلمان کیسے غلط راستے پر اندھا دھند چلے جا رہے تھے مولانا کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مولانا کے مخالف تھے ان کے متعلق مولانا کی مایوسی بے جا نہ تھی، مولانا کو اپنی زندگی میں رفیقوں اور دوستوں کی تائید سے اسقدر محرومی رہی اور مخالفوں کی مخالفت کا اسقدر سامنا کرنا پڑا کہ اس حالت کے اثر نے انکی خلوت پسند طبیعت کو اور بھی زیادہ خلوت پسند اور کم آمیز بنا دیا۔ ان کی زندگی کے آغاز میں مولانا کے مزاج کی خصوصیات کو سمجھنے اور ان کی قدر کرنے والے چند ہی آدمی تھے اور ان میں بھی سب سے زیادہ محترم علامہ شبلی مرحوم تھے پھر جب مولانا نے ایک وسیع تر سیاسی اور سماجی زندگی کے دائرے میں قدم رکھا تو اس میدان میں ان کی خطابت اور جی بی ایس (Genius) اور علم و فضل سے مرعوب و متاثر ہونے والے تو بہت تھے لیکن ان کی بات کو سمجھنے والے کم تھے شروع ہی سے مولانا کے اور مولانا محمد علی مرحوم اور انکی جماعت کے درمیان اشتراک افکار کی راہیں مسدود رہیں۔ یہ کوئی راز نہیں ہے کہ نہ تو مولانا علی برادران کے طرز فکر سے قریب آ سکے اور نہ علی برادران کبھی مولانا کی خلوت افکار کے کسی گوشے سے آشنا ہو سکے یہ زمانہ وہ تھا کہ علی برادران قومی جدوجہد کے میدان میں نمایاں ہونے لگے تھے۔ اور یہی زمانہ وہ تھا جب مولانا کی آواز الہلال کے ذریعہ تمام ملک میں گونجنے لگی تھی مگر ان دونوں کے ذہنی تصادم کے کافی اسباب موجود تھے یہ تصادم بظاہر تو کبھی زیادہ تلخ نہیں ہوا (سوائے مسلم یونیورسٹی کے مسئلے کے جس کا بعد میں ذکر آئے گا) لیکن اندرونی طور پر اسقدر زیادہ تھا کہ ان دونوں کے طرز فکر میں کوئی خاص اتصال پیدا ہی نہ ہو سکا حد فنت کی تحریک میں

یہ وہی انداز بے نیازی جس کو میں نے مولانا کی انفرادیت اور انانیت سے منسوب کیا ہے، عوام کی خدمت کے میدان میں یہ انفرادیت کس حد تک کام آئی، یا آ سکتی ہے یہ الگ بحث ہے۔ لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ مولانا اگر جی نی یس (عبقری) ہیں اور بلاشبہ ہیں تو اسی عبقریت سے پیدا ہونے والی انفرادیت نے انہیں عمومیت کے لازمی گرد و غبار سے ہمیشہ بچائے رکھا۔ باوجودیکہ وہ عوامی تحریکات کے رہنما کی حیثیت سے بارہا منظر عام پر آئے۔ لیکن ان کی عبقریت کا مطالعہ کرنے والا انہیں عوامی رہنما (اصطلاح عام) تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ان کی (جی نی یس) نے انہیں ایک ایسی سطح پر پہنچا دیا ہے جہاں خوشی اور ناخوشی، تسکین و اضطراب افکار و عمل اور کسی چیز میں بھی ان کے اور عوام کے درمیان کوئی نقطۂ اشتراک موجود نہیں۔ وہ نہ تو اپنی امیدوں میں، اور نہ اپنی مایوسیوں میں عوامی افکار کو شریک کر سکتے ہیں۔ مولانا کی نفسیات میں عمومی زندگی سے جو بعد اور راہ و رسم دیکھنے سے جو بیزاری نظر آتی ہے اسے میں ایک قسم کا "احساس شکست" (Frustration) کہتا اگر یہ نہ سمجھتا کہ اس اصطلاح کے غلط اور میرے مفہوم سے جدا اور مولانا کے لئے توہین آمیز معنی بھی لئے جا سکتے ہیں

"اس عالم اثر و تاثر میں ہر چیز کی طرح ہر فعل بھی اپنا ایک قدرتی مزاج اور طبیعت رکھتا ہے۔ تخریب کے مزاج میں شورش اور ہولناکی ہے تعمیر سرتاسر سکون اور خاموشی، تعمیر۔ جمع، نظم ترتیب اور ایجاب ہے۔ تخریب —— تفرقہ، برہمی، اضطراب، اور سلب و نفی، جمع و نظم کی حالت سکون ہے، اور تفرقہ و برہمی کی حالت شورش و اضطراب —— دیوار جب بنتی ہے تو کوئی ہولناکی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر اس کے گرنے میں دھماکہ ہوتا ہے اس لئے تخریب کا عمل قدرتی طور پر تعمیر سے زیادہ نمایاں اور پُرشور ہے۔ تخریب کی ہیبت فوراً ڈرا دیتی ہے۔ لیکن تعمیر کی دل آویزی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ تخریب کا دھماکہ دور سے بھی سن لیا جا سکتا ہے لیکن تعمیر کا خاموش عمل دیکھنے کے لئے نزدیک آنے کی ضرورت ہے۔"

(ابوالکلام آزاد)

دوستوں میں مہاتما گاندھی حکیم اجمل خاں آصف علی اور سی، آر، داس اور زندوں میں پنڈت جواہر لال نہرو۔ کانگریس کے اندر ساری عمر گذار دینے کے باوجود مولانا کے رفیقوں اور ایسے لوگوں کی جو مولانا کے ساتھ حقیقی اشتراک افکار رکھتے تھے اگر کوئی فہرست مرتب کی جائے تو ایک اور دو اور تین اور چار کے بعد ہی شاید وہ گنتی ختم ہو جائے گی یہ اس پس منظر کا ایک خاکہ ہے جس سے مولانا کی فطرت میں مایوسی، بیزاری، خلوت پسندی اور کم آمیزی کے عناصر کو تقویت حاصل ہوئی۔

غبار خاطر کے ایک مکتوب میں شاخ بریدہ کو ایک مثال بنا کر دنیا کے حالات سے اپنی افسردگی اور بے پروائی کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں۔

"یہاں (قلعہ احمد نگر میں) احاطے کے شمالی گوشے میں ایک نیم کا درخت ہے کچھ دن ہوئے ایک وارڈر نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی۔ اور حوض کے پاس پھینک دی تھی اب مارچ ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا، شاخوں نے نئے پیرہن اتار کر بہار و شادمانی کا نیا جوڑا پہن لیا۔ اب ہر ٹہنی کو دیکھو ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید پھولوں سے لدی ہوئی ہے لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے یہ بھی اسی درخت کی ایک شاخ ہے جسے برسات کے آتے ہی زندگی اور شادمانی کا نیا جوڑا پہنا دیا یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی مگر اسے اب دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ بہار و خزاں، گرمی و سردی، خنکی و طراوت سب اس کے لئے یکساں ہو گئے۔ کل دوپہر کو اس کی طرف سے گذر رہا تھا کہ یکایک اس شاخ بریدہ سے پاؤں ٹکرا گیا میں رک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ بے اختیار شاعر کی حسن تعلیل یاد آ گئی۔

قطع امید کردہ نہ خواہد نعیم دہر
شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست"

آج سے تیس سال پہلے بھی جو مولانا کے ذہنی قوی اشباب کی منزل تک پہنچ چکے تھے وہ اپنے اندر یہ احساس بہت قوی پاتے تھے کہ "کس زبان مرا فہمد" ـــــ تذکرہ کے اوراق پر انہوں نے اپنی اس حالت کا بار بار ذکر کیا ہے اپنے نام پر خود ہی تبصرہ فرماتے ہیں :۔

"والد مرحوم نے نام فیروز بخت رکھا تھا۔ سبحان اللہ! بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی، عمر بعرشوں اور ٹھوکروں کی پامالی میں بسر ہو چکی اب تو شاید باقی ہے وہ دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ منزل مقصود کا پتہ، شاہراہ اور منزل پر قدم ـــــ جتنی زندگی گذر چکی، منہ موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ اپنی سرگذشت اور روئداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں۔ ایک نمود غبار اور جلوۂ سراب کی تاریخ حیات قلمبند ہو تو کیونکر ہو دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اڑتے ہیں، طوفان نے درخت گرا دیئے، سیلاب نے عمارتیں بہا دیں، عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن چن کر تنکے جمع کئے۔ خرمن و برق کا معاملہ ہے۔ آتش و خس کا افسانہ ان سب کی سرگذشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے میری پوری سوانح عمری بھی ان ہی میں مل جائے گی نصف افسانہ امید اور نصف ماتم یاس ـــــ"

اپنی ذہنی مشکلات اور معنوی کوائف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں :۔

"جس راہ میں قدم اٹھایا، زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں پناہ لی، وہی زندان ہوس و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو اس کا ذکر کیجئے ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنیے ـــــ"

ان اوراق کو ترتیب دیتے وقت میں بہر ممکن کوشش اس بات کی کرتا رہا کہ جہاں کہیں مولانا نے اپنے متعلق کچھ فرمایا ہے اس کو اکٹھا کر دوں۔ اس جستجو کے سلسلہ میں ابوسعید بزمی صاحب کا ایک کتابچہ بھی نظر سے گذرا۔ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، کتابچہ کے مندرجات کا عام رجحان بہ زیادہ تر مدحیہ مداحی کی طرف ہے لیکن کہیں کہیں مجھے کام کی باتیں بھی مل گئیں، ایک مقام پر بزمی صاحب لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے مولانا سے کہا کہ عوام ان کی جد و جہد سے پوری طرح واقف نہیں تو ـــــ

"میرے بھائی ـــــ مولانا نے بڑی بے پیاری سے کہا ـــــ میں نے اس چیز کی کبھی آرزو نہیں کی کہ لوگ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے"۔

آزردہ زمن حال شب وصل چہ پرسی
بے دل خرم داشت نہ از دل خرم بود

مولانا نے پوچھا کہ "بی، اے کرنے کے بعد کیا ارادہ ہے؟" میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ اخبار جاری کروں گا تاکہ ملک وملت کی کچھ خدمت بجا لاؤں۔ فرمایا "مشغلہ اچھا ہے، تمہیں اندازہ ہے کہ اس منزل مقصود تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟ فرض کرو کہ ابتدائے کار ہی میں آرزو کے مطابق سامان میسر آجائے تو اخبار کے استقلال اور اس کی آواز کی پذیرائی کے لئے کم ومیش دو سال کا انتظار تو ضروری ہوگا۔ پھر دو سال اس پذیرائی کے نتائج کا انتظار کرنا ہوگا۔ گویا جس ذریعۂ خدمت سے کام لینے کا ارادہ لئے بیٹھے ہو اس کے نتائج دیکھنے کے لئے کم از کم چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک حالات کی رفتار ایسی ہے کہ اس مدت کے ایک حصے کا بھی انتظار مشکل ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس اثنا میں کیا کچھ ہو جائے گا۔" میں دم بخود رہ گیا اور عرض کیا کہ آپ فرمائیں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ فرمایا کہ امتحان سے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔

الہلال بند ہو چکا تھا مولانا نے "البلاغ" نکالا۔ تو اس کے ساتھ ہی کلکتہ میں دار الارشاد قائم کر دیا۔ جس میں وہ منتخب نوجوانوں کو قرآن حکیم کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ قومی اور دینی کارکنوں کی تعلیم وتربیت کا وہ مرکز تھا جس کے لئے مولانا الہلال کے زمانے سے انتظامات کر رہے تھے لیکن دار الارشاد کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ حکومت بنگال نے انہیں بنگال کے حدود سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ رانچی چلے گئے تو وہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی البلاغ بھی بند ہو گیا۔ اور یہ دار الارشاد بھی۔ اس اثنا میں درس اڑھائی سپاروں تک پہنچا تھا۔ میرے دل میں ان کی ذات بابرکات سے استفادہ کی جو آرزوئیں موجزن تھیں وہ بھی مدفون ہو کر رہ گئیں۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سنہ ۱۹۲۰ء میں نظر بندی سے رہا ہوئے تو ملک میں ترک موالات کی تحریک جاری ہوئی اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے وقف ہو گئے۔ میں اس زمانہ میں "زمیندار" سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ان سے نیازمندی کے روابط کی تجدید ہوئی، اگرچہ سیاسی افکار میں ـــــ بعض اوقات اختلاف کی صورت بھی پیش آتی رہی لیکن رشتۂ عقیدت بدستور قائم رہا اور ذاتی تعلقات میں بفضل اللہ کوئی خلل نہ آیا۔ ہمارے عہد کی عام حالت یہ ہے کہ کسی ہستی کی بنا پر بھی کسی سے اختلاف ہو تو اسے ناقابل برداشت سمجھا جاتا ہے لیکن مولانا اپنے دوسرے اوصاف ومحامد کی طرح اس وصف میں بھی یگانہ حیثیت کے مالک تھے کہ رائے کے اختلاف یا مسلک کے تفاوت کو انہوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

میں ان کے بے مثال علم وفضل کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ جو نصف صدی سے اس وسیع سرزمین کے آسمان پر آفتاب جہاں تاب کی طرح تابندہ و درخشندہ ہے۔ وہ ان اصحاب میں سے تھے جنہیں قدرت صدیوں کے بعد عالم انسانیت کو اپنی خاص نعمت کے طور پر عطا کرتی ہے وہ تحریر وتقریر دونوں اقلیموں کے تاجدار تھے۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اس زمانہ میں بھی مشہور فرماں روایان علم وفضل کے لئے یکسر حیرت انگیز تھیں جب ان کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی سنہ ۱۹۰۳ء میں وہ پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کیلئے لاہور آئے تو خواجہ الطاف حسین حالی بھی تشریف لائے ہوئے تھے مولانا وحید الدین سلیم مرحوم مولانا کو لے کر خواجہ صاحب مرحوم کی خدمت میں پہنچے تو پوچھا کہ خواجہ صاحب اس لڑکے کی عمر کتنی ہوگی؟ انہوں نے فرمایا کہ چودہ پندرہ سال کے ہوں گے۔ سلیم نے کہا یہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان کے باپ ایڈیٹر ہوں گے۔ جب معلوم ہوا کہ یہی ایڈیٹر ہیں تو متحیر ہو گئے اور بہت شفقت فرمائی۔ اس وقت سے مولانا کے ساتھ گہرے روابط پیدا ہو گئے۔ الہلال کا ابتدائی دور تھا کہ مولانا ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے۔ خواجہ حالی کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد حسین بھی اس میں شریک تھے ان کے ہاتھ خواجہ صاحب نے مولانا کو بہت بہت سلام کہلا بھیجا، نیز فرمایا کہ الہلال آتا ہے تو چار چار پانچ پانچ دن اس کے سوا کوئی مشغولیت نہیں رہتی۔

شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم سے بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا ان سے مولانا کی خط وکتابت تھی۔ شبلی سنہ ۱۹۰۵ء میں بمبئی گئے تو اس زمانہ میں مولانا وہیں مقیم تھے۔ ایک دوست کے ہمراہ ملاقات کے لئے پہنچے دوست نے تعارف کرایا تو شبلی کو یقین نہ آیا کہ ابو الکلام آزاد یہی ہیں۔ جب شک کی گنجائش نہ رہی تو اس درجہ گرویدہ ہوئے کہ "الندوہ" کی اڈیٹری سونپ دی اور مولانا نے سنہ ۱۹۰۵ء کے اواخر سے سنہ ۱۹۰۶ء کے اوائل تک یہ خدمت انجام دی۔

بہرحال جو وجود عمر کے ابتدائی مراحل میں وقت کے اکابر علم وفضل کے لئے باعث حیرت واستعجاب بن گیا تھا اس کی شان وعظمت کے متعلق میں کج مج زباں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مولانا کو خدا نے غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا۔ اس کی محسوس و مشہور مثالیں "تذکرہ" اور "غبار خاطر" کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہیں۔

غلام رسول مہر

زباں پہ بارِ خدایا......

۱۹۱۳ء کے موسم گرما کا آغاز تھا۔ میں ایف اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست دستخط کے لئے ایک فارم میرے پاس لائے اور بولے کہ "حزب اللہ" کے ممبر بن جاؤ۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ نام سنا تھا، لیکن دوستوں پر اعتماد تھا، اسلئے تردد کے بغیر دستخط کر دیئے، دیکھا کہ چھوٹا سا فارم ہے اس پر ٹائپ میں تین چار سطریں چھپی ہوئی ہیں، اور جلی حروف میں "مَنْ انصاری الی اللہ" مرقوم ہے، اس کے نیچے قرآن مجید کی ایک آیت ہے اور اس کے ساتھ اردو ترجمہ۔ پایانِ تحریر میں نام، پتے، عمر اور پیشے کی جگہ خالی چھوڑ رکھی ہے، چند روز بعد میں اس فارم کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ ایف اے کا امتحان دے کر گھر جانے لگا تو دوستوں سے پوچھا کہ کوئی دلچسپ مشغلہ بتاؤ جس سے نتیجۂ امتحان تک انتظار کا وقت بخوبی گذر سکے۔ انہوں نے کہا کہ اخبار جاری کرا لو۔ اور ساتھ ہی دو اخباروں کے نام تجویز کر دیئے۔ ایک روزانہ "زمیندار" دوسرا ہفتہ وار "الہلال"۔ الہلال کا چندہ اس زمانہ میں آٹھ روپیہ سالانہ تھا اور اعلان ہو چکا تھا کہ جو لوگ ایک معین مدت میں خریداری کی درخواست کریں گے ان کے چندے میں سے ساڑھے سات روپے "ہلال احمر فنڈ" میں بھیج دیئے جائیں گے۔ میں نے "ہم خرما و ہم ثواب" کے پیش نظر فوراً درخواست بھیج دی لیکن اسوقت تک "الہلال" کی شکل دیکھی تھی، نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کس طرح کا پرچہ ہے۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ "حزب اللہ" کا فارم "الہلال" کے دفتر ہی سے آیا تھا۔

میں گھر پہنچا تو چند روز بعد "الہلال" کا وی پی آ گیا۔ پرچہ کھولا تو ٹائپ میں چھپا ہوا تھا اور ٹائپ کے پڑھنے کا میں عادی نہ تھا۔ تکلف سے عبارت پڑھنی چاہی، تو وہ عربی الفاظ و تراکیب سے لبریز تھی اور جا بجا آیات درج تھیں کچھ وقت صرف کرنے کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ ممکن ہے "الہلال احمر فنڈ" میں چندہ دینے کا ثواب میرے نامہ اعمال میں لکھا جائے لیکن "خرما" کی امید تو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ پرچہ ویسے ہی رکھ دیا۔ اور اس کے کسی حصہ سے استفادہ کا سوال باقی نہیں رہا۔ آٹھویں دن پرچہ آتا تھا۔ میں اسے کھولتا اور پڑھے بغیر ایک جگہ رکھتا جاتا۔ ساتواں پرچہ آیا تو اس میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کا ذکر تھا۔ میں چونکہ اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا اسلئے طبیعت پر جبر کر کے مضمون پڑھا کہ جس جماعت سے وابستہ ہو رہا ہوں اس کے مقاصد سے آگاہی لازم ہے۔ فارغ ہوا تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ پھر تمام پرچوں کو اول سے آخر تک حرفاً حرفاً دیکھا اور اس امر پر افسوس کرتا رہا کہ پہلے ہی دن اس کا باقاعدہ مطالعہ کیوں نہ شروع کر دیا۔

بے غمِ عشق تو صد حیف زعمرے کہ گذشت
حیف ازیں کاش گرفتارِ غمت می بودم

میں گاؤں میں رہتا تھا جہاں ہفتے میں تین مرتبہ ڈاک آتی تھی "الہلال" کی آمد کے دن ڈاکیئے کی پیش وائی کے لئے جوش اشتیاق میں ڈیڑھ میل نکل جاتا جہاں وہ ملتا وہیں سے پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا اور جو عزیز اور دوست ملنے کے لئے آتے ان کو ایک ایک مضمون سناتا۔ یہ الہلال سے عشق و شیفتگی کی ابتدا تھی اسی وقت سے مولانا ابوالکلام سے عقیدت کا رشتہ استوار ہوا چالیس سال کی مدت میں وابستگی اور انقطاع کی سینکڑوں منزلیں طے کیں لیکن۔ رشتۂ ارادت استوار رہا۔ اور آج بھی جبکہ آخری منزل قریب نظر آتی ہے اس تعلق کو زندگی کی عزیز ترین متاع سمجھتا ہوں۔

اسی زمانے میں مولانا سے خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔ مولانا سے ملاقات ۱۹۱۴ء میں ہوئی جب میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ وہ راولپنڈی کانفرنس سے مراجعت پر بریگنزا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے چند احباب کی معیت میں زیارت کے لئے گیا اور انہیں دیکھا، اپنے ذہن میں جو تصور قائم کر رکھا تھا اس سے بالکل مختلف نکلے۔ میانہ قد و قامت، جسم بہت دبلا پتلا، رنگ سرخ و سفید، داڑھی مونچھ صاف کمبل اوڑھے پلنگ پر لیٹے تھے صرف چند منٹ سرسری باتیں ہوئیں۔ میرا تعارف ہوا تو فرمایا آج شام کے چار بجے ملو۔ وقت مقررہ پر حاضر ہوا تو ان کے علم و فضل کا رعب میرے دل پر اسقدر چھایا ہوا تھا کہ جذبات حسرت و دل ہی دل میں موزوں الفاظ کا لباس پہنانے کیلئے ہر کوشش ناکام رہی۔ گویا یہ نقشہ پیش تھا ؎

رکھا تھا، تو ان تمام قربانیوں کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا جو اس سفر کے لوازم میں شامل تھیں۔ پے در پے وہ قربانیاں طلب کی گئیں تو مولانا نے ایک صاحب عزیمت انسان کی طرح انہیں پیش کرنے میں تامل نہ کیا، واقعی تعلقات کے سلسلے میں غالباً یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ان سے مطالبہ ہوا۔

ایک مرتبہ انہوں نے لکھے تحریر فرمایا تھا۔

"ہر وقت اسے پیش نظر رکھئے کہ استقامت اصل کار ہے
اگر ایک آدمی نوکری قبول نہیں کرتا، تو یہ کوئی جرم نہیں۔ لیکن
اگر سپاہی بن کر اور میدان جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی
سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی ؎

ہاں رہِ عشق ہست کہ رفتن مدار و باز گشت

حرم را بجا عقوبت ہست و استغفار نیست

دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیئے لیکن جب
اتر گئے تو موجوں کا شکوہ فضول ہے، ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں
خونخوار نہنگوں کا سامنا ہو جائے۔ لیکن جو شخص سمندر میں کودتا
ہے اسے نہنگوں کے وجود سے بے خبر نہ ہونا چاہیئے۔"

مولانا کی ذات گرامی اس تعلیم ہی کا نہیں بلکہ ہر اس تعلیم کا عملی نمونہ رہی ہے جو ان کی زبان پر جاری رہی بلاشبہ ان کے قلب پر کبھی رنج والم کی تمام کیفیتیں پوری شدت سے طاری ہوئیں جو عزیز ترین رشتوں سے انقطاع کا لازمہ ہے لیکن انہوں نے مقام صبر کے واجبات جس شان عزیمت سے ادا کئے اس کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں، موجبات غم سے متاثر ہونا تو قلب سلیم کا خاصہ ہے لیکن احساسات پر قابو پا لینا صرف صابرین صفرین کا کام ہے

ان کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے جب ہم قوموں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف کیا، میرے علم کے مطابق وہ اپنے لئے سنہ ۱۹۱۲ء میں جو راہ عمل طے کر چکے تھے اس پر مدت العمر بے خوف لومۃ لائم قائم رہے بیچ میں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعویدار ان عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ انہوں نے اپنا مسلک بدلنے کیلئے معقول دلائل بھی فراہم کر لئے۔ لیکن مولانا کے نزدیک صحیح مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انہوں نے سنہ ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا اس سلسلے میں انہیں بیشمار قربانیاں کرنی پڑیں کم و بیش سولہ سال قید و بند میں گزارے۔ ان کے نہایت اہم دینی و علمی مشاغل کو سخت نقصان پہنچا وہ وسائل معاش بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انہوں نے اپنی طبیعت کے، ذوق کے مطابق اختیار کر لئے تھے اور جن میں وہ ستے

بڑھ کر کامیاب تھے لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہاتر قربانی یہ تھی کہ ان کی ہر دلعزیزی کی متاع عظیم عمل کے راکھ کا ڈھیر بن گئی وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے وہ جس طرف نکلتے تھے لوگ اپنی آنکھیں ان کے لئے بچھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے لئے مسلسل و متواتر عقیدت کی جن گرمجوشیوں کا اظہار ہوتا رہا وہ کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئیں۔ اور یہ غیر معمولی ہر دلعزیزی انہیں اس وقت حاصل تھی جب ان کی عمر ۱۲ اور ۳۰ کے درمیان تھی۔ خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان سے محبت و عقیدت کا سبب عرفانہ تھی یعنی وہ ان رہنماؤں میں نہ تھے، جنہیں مختلف گروہوں نے صاحب اقتدار و اقتدار دیکھ کر تحصیل مقاصد کا ذریعہ سمجھ لیا ہو۔ لیکن انہیں پیش نظر مقاصد کیلئے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دلعزیزی کی متاع عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق سمجھتے تھے، اس سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہ ہوئے یہ قربانیاں ذکر و بیان میں بہت دلچسپ معلوم ہوں۔ لیکن ان پر عمل سہل نہیں۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

نیست آساں بر صف آتش زدن

می نماید گرچہ از پروانہ خوش

مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع ہے اور اپنے علمی و عملی جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ بالکل یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے ان کی فطرت ثانیہ بنی رہی۔ وہ ہمیشہ اول وقت اٹھتے۔ گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر تھے ؎

عبادت سحری را مکن نظیری کم

کہ ہر چہ کرد دعاہائے صبح گاہی کرد

وہ ایک زمانے میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً سنہ ۱۹۲ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور آخر تک اسی پر قائم رہے ——— وہ ابتدا ہی سے ہلکی غذا کھانے کے عادی تھے۔ لطیف چینی چائے وقتاً فوقتاً ضرور پیتے ——— اس کے دلکش تذکرے "غبار خاطر" میں جا بجا موجود ہیں انہوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارہ نہیں کیا حتیٰ کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ یا نذر بآسانی قبول نہیں کرتے تھے جنہیں انتہائی شفقت و نوازش سے انہوں نے عزیزوں کا درجہ دے رکھا تھا۔ ایک مرتبہ انہیں عرق النساء کا عارضہ ہوا۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے انہوں نے فرمایا کہ مولانا سے بیماری کے مفصل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ میں ایسا نسخہ تجویز کر دوں گا کہ نقصان عارضہ دوبارہ نہ ہوگا میں نے حالات منگوائے، حکیم

"تذکرہ" رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں لکھا گیا جب مولانا کے پاس کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہ تھی "غبارِ خاطر" کے خطوط احمد نگر کی اسیری کے زمانہ میں مرتب ہوئے۔ اس وقت بھی وہ کتابوں سے بڑی حد تک محروم تھے لیکن ان کتابوں کے مطالعہ سے ہر شخص پر آشکارا ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانوں میں بیٹھ کر بھی اس قسم کی چیزیں مرتب نہیں کی جا سکتیں۔ "غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور اس کی کاپیاں دیکھنے کا کام مجھے سونپا گیا تھا۔ "مآثر الامراء" کی ایک عبارت کے متعلق میرے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ مطبوعہ کتاب میں عبارت وہی تھی جو مولانا نے "غبارِ خاطر" میں درج کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کتب ایڈٹ کرنے والے نے ایک لفظ کے سمجھنے میں غلطی کی۔ استصواب کی غرض سے مولانا کو لکھا۔ فرمایا منقولہ عبارت درست ہے اور یہ "مآثر الامراء" کی فلاں جلد کے فلاں صفحہ پر فلاں حرف اوپر کی سطر میں موجود ہے۔ میں نے تیس سال پیشتر "مآثر الامراء" دیکھی تھی اور یہ الفاظ اسی طرح لوحِ حافظہ پر منقوش ہیں"

عزیمت و استقامت مولانا کے آئینۂ صبح کے درخشاں ترین جوہر ہیں انہوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جمے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا۔ کاروبار تباہ ہوا۔ ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسودے ضائع ہو گئے۔ انہوں نے علمی یادداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے۔ لیکن ان کی شانِ عزیمت ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔

ذاتی تعلقات کے سلسلہ میں ایک نہایت دشوار و دلگداز مرحلۂ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر کی اسیری کے زمانہ میں ان کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہوئیں۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ اگر رفیقۂ حیات کی شدید علالت کی بنا پر مشروط رہائی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ میں پیش کر دی جائے گی لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرنٹنڈنٹ نے پنڈت جواہر لال کی وساطت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے مجھے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا۔ لیکن شاید باطن کامیاب نہ ہو سکا"

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"میں نے تمام معمولات جاری رکھے لیکن ... اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کی ایک بناوٹ تھیں جس سے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

اس کے باوجود مولانا نے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحبِ عزیمت، رفیقۂ حیات اس حالت میں دنیا سے رخصت ہوئیں جب وہ سینکڑوں میل دور اپنے اہم اصول و مقاصد کی خاطر احمد نگر کے قلعہ میں محبوس تھے۔ اصول و مقاصد کی قربان گاہ پر عزیز ترین رشتوں کو وہی ہستیاں اس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنہیں مبدءِ حیات سے عزیمت و استقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارزانی ہوئی ہوں۔

مبادا کسی کو خیال ہو کہ مولانا اس انتہائی اضطراب و پریشانی سے محفوظ نہ رہ سکے، جیسا کہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے، یہ سچ ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہ ہوگا۔ صبر کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان موجباتِ غم کی شدت و فراوانی کے باوجود اپنے احساساتِ حزن پر قابو پائے اور انہیں مناسب حدود سے تجاوز کرنے کا موقع نہ دے۔ یہ نہیں کہ احساسات سرے سے باقی ہی نہ رہیں اور انسان کا دل پتھر بن جائے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کی طرح مولانا طبعی احساسات سے بدرجۂ اتم بہرہ مند تھے کون اندازہ کر سکتا ہے کہ رفیقۂ حیات کی خطرناک علالت کا خط ملتے ہی ان کے دل پر کیا قیامت گذری ہوگی۔ خصوصاً اس حالت میں کہ وہ اسیر تھے اور پاس رہ کر تیمارداری بھی نہ کر سکتے تھے جو اکثر انسانوں کے لئے فی الجملہ باعثِ تسکینِ قلب ہوتی ہے یقیناً انہیں بھی آرزو ہوگی کہ رہائی ملے تو خود اپنی اہلیہ کا علاج کریں اور تا بہ حدِ امکان اس کا دکھ بٹانے کی کوشش کریں لیکن ان کے سامنے زندگی کے اہم مبادی اصول و مقاصد بھی تھے وہ کوئی ایسی صورت قبول نہ کر سکتے تھے جو ان اصول و مقاصد کی آبرو پر اثر انداز ہوتی انہوں نے جب اس راستے میں قدم

ایک تبصرہ

محمد عتیق صدیقی

انڈیا ونس فریڈم

(از مولانا ابوالکلام آزاد)

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

"سوانح حیات مرتب کرنے کے لئے، قدرتی راہ یہی ہے کہ موت کا انتظار کیا جائے۔ جب تک میری زندگی مجھ میں اور لوگوں میں حائل ہے، شاید وہ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ صحیح وقت اس کا میرے بعد آئے گا، کیوں نہ اس کا انتظار کیا جائے۔"

(نقوش لاہور (۱۹۵۸ء) ص ۹۶)

مندرجہ بالا اقتباس ایک مکتوب سے اخذ کیا گیا ہے، جو مولانا مرحوم نے انتقال سے بیس سال قبل لکھا تھا اور اُن کے انتقال کے گیارہ مہینے بعد اُن کے خود نوشت حالات "انڈیا ونس فریڈم" کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کا ایک دلچسپ اور قابل لحاظ پہلو یہ ہے کہ مولانا مرحوم نے یہ کتاب زندگی صرف مرتب ہی نہیں کرائی تھی، بلکہ ان کی خواہش تھی کہ اُن کی سترویں سالگرہ کے موقع پر شائع کی جائے مگر موت نے اس کی مہلت نہ دی —— شاید اس کو مولانا کی مندرجہ بالا پیشین گوئی کی عزت رکھنی تھی چنانچہ یہ کتاب ان کی وفات کے گیارہ مہینے بعد شائع ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کے تحت الشعور میں موت کی قربت کا احساس شاید پیدا ہو گیا تھا، اور اسی احساس نے اس کام پر ان کو آمادہ کیا۔ پڑھنے والا یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ تحریک آزادی ہند کا تاریخی مواد ہندوستان و انگلستان کے ارباب حل و عقد کے سیاسی کردار و رجحانات کا تجزیہ، رازہائے درون خانہ کی جھلکیاں، اور اسی طرح کی دوسری باتیں جس بے لاگی سے اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں —— یہی اس کتاب کا سرمایہ افتخار ہیں —— ان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اس کی اشاعت کے لئے "موت کا انتظار" کیا جاتا۔

کتاب کے دیباچے سے جو ہمایوں کبیر صاحب نے لکھا ہے، ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ آج سے دو سال قبل انھوں نے مولانا مرحوم سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے حالات مرتب فرمائیں۔ مولانا اس کے لئے آمادہ نہ ہو سکے، لیکن جب ان سے بار بار کہا گیا کہ اقتدار اعلیٰ کو ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل کرنے کے سارے معاملات چونکہ انھوں نے طے کرائے تھے اور اس سلسلے کی تمام کانفرنسوں اور جملہ گفت و شنید میں انھوں نے کانگریس کی نمائندگی کی تھی، اس لئے یہ اُن کا اہم ترین فرض ہے کہ اُن تمام واقعات کی تفصیل وہ خود قلم بند کریں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ مولانا واقعات بیان کریں گے اور ہمایوں کبیر صاحب ان کو قلم بند کرتے جائیں گے۔

جب ایک باب ختم ہوتا تو اس کو مرتب کر کے کبیر صاحب مولانا کے سامنے پیش کرتے اور وہ اپنے قلم سے اس مسودے میں حذف و اضافہ کرتے اس طرح سے ستمبر ۱۹۵۶ء میں کتاب تیار ہو گئی۔ اس کا ٹائپ شدہ مکمل مسودہ جب مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا تو نظر ثانی کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے مختلف تیس صفحات فی الحال شائع نہ کئے جائیں۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق مکمل کتاب کا ایک ٹائپ شدہ سربمہر مسودہ نیشنل لائبریری (کلکتہ) اور ایک مسودہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (دہلی) میں جمع کر دیا گیا۔ حذف شدہ مسودہ از سر نو ٹائپ ہوا اور نومبر ۱۹۵۶ء میں پھر مولانا کی خدمت میں پیش

صاحب مرحوم نے خوب غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور یہاں سے دوائیں بھیج دی گئیں۔ اس سے فائدہ ہوا۔ حکیم صاحب کی رائے تھی کہ وہ دوائیں کچھ دنوں جاری رہنی چاہئیں (جواب میں) مولانا نے لکھا۔

"مجھے حکیم صاحب کی دواؤں کے استعمال میں ہرگز تامل نہیں۔ اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جوہر مشک وغیرہ استعمال کرنا چاہیئے تو ضرور کروں گا ـــــ مگر شرط یہ ہے کہ وہ دوا خانے کو حکم دے دیا کریں، تاکہ مجوزہ مرکبات وی پی پارسل کے ذریعہ بھیجتے رہیں اس صورت میں شکر گذار ہونگا اور انشراح خاطر سے علاج کروں گا۔ ورنہ طبیعت رک جاتی ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہیئے نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہ کریں تو پھر میں نہ تو مراع خاطر کے ساتھ دوا استعمال کروں گا، نہ اِستردادِ اجر کی حالت گوارا ہو سکے گی۔"

ایک مشہور عالم دین نے مولانا کی تفسیر فاتحہ کے بعض حصوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا ایرادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ ضمناً یہ بھی لکھا تھا کہ کتاب آپ نے نہیں دیکھی تو میں بھجوا دوں۔ فرمایا کتاب ہرگز نہ بھیجو۔ یہی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں۔

"۱۹۱۸ء سے میں نے جن باتوں کا عہد کر لیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا۔"

پنجاب کے ایک سیاست داں نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک یکسر بے اصل تھیں انہوں نے مجھے لکھا:۔

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا جب "الہلال" نکلتا تھا تو یہ اس صریح کذب بے کہ بین علوم کی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح عمل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آ جاتا ہے میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو برا کیوں نہ کہوں۔"

"اگر ایک مدعی اسلام میں صدق مقال نہیں، تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل۔"

ایک مرتبہ دیر تک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک عریضے میں شعلہ اصفہانی کا یہ شعر لکھ دیا ؎

آں بخت نہ داریم کہ ہم سر ہم تو باشیم
ما دسرِ راہ توو آہے و نگاہے

انہوں نے جواب میں فرمایا کہ اس شعر کا یہاں کیا موقع تھا۔

ایک حدیث قدسی ہے من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعاً (جو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے میں ایک ہاتھ اسکے قریب جاتا ہوں) عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تعلق سے محروم رہوں۔ اب بھی اسی پر عامل ہوں اور عامل رہونگا ؎

ہزار بار وصد ہزار بار بیا

مضمون بہت طویل ہو گیا لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ وہی عرفی والی بات ہوئی کہ ؎

رہاں رنگسترِ فرد ماند و رازِ من باقیست ۔۔۔ بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

آخر میں مولانا کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو انکے طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ علمی بحثیں فرمائے تھے کہ خلاف عادت انکے قلم سے یہ الفاظ بے اختیار نکل گئے فرماتے ہیں:۔

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی ؎

روا لودہ مارا رجہاں جنس وفا ۔۔۔ رونقے گشتم و ازطالع دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے مذہب علوم و فنون ادب انشاء شاعری کوئی وادی ایسی نہیں جسکی بیشمار نئی راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو حدیکہ ہر دور اپنے آپکو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا اس نے سرو سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اسکے حوالے کر دیا گیا ـــــ"

جو کچھ فرمایا گیا ہے نہ سخن گستری نہ تعلی، بلکہ سراسر حقیقت ہے، کاش مجھے اندازہ شناسی میں رسائی درجہ نصیب نہیں ہوتا، تو اس کی زبان سے کہتا ؎

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود ۔۔۔ بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

کے اکھاڑے میں اُتر آیا۔ ابتدا میں جاپان حیرت انگیز تیزی سے پوربی ایشیا پر چڑھ دوڑا اور اس کی فوجیں برما کو روندتی ہوئی ہندستان کی پوربی سرحدوں کے قریب پہنچ گئیں۔ اس پس منظر میں وائسرائے نے مولانا اور جواہر لال کو بلایا، اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جنگ کی نئی صورت حال کے متعلق کانگریس کے جذبات کا اندازہ لگایا جا سکے۔

مولانا کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۔

"گاندھی جی کے لئے یہ بڑا ہی صبر آزما زمانہ تھا، وہ دیکھ رہے تھے کہ جنگ ساری دنیا کو تباہ کر رہی ہے اور وہ بے دست و پا ہیں، بسا اوقات وہ اس صورت سے اس درجہ مغموم ہوتے کہ خودکشی کا ارادہ کر لیتے۔ انھوں نے مجھ سے کہا، کہ جنگ کی تباہ کاریوں کو روکنا اگر میرے بس سے باہر ہے، تو اپنی زندگی کو ختم کر کے، کم از کم ان تباہیوں کا تماشائی تو نہ ہوں!"

جنگ میں ہندستان کی شرکت کے سوال پر گاندھی جی اور مولانا کے خیالات متضاد تھے۔ گاندھی جی آزادی کے بدلے میں بھی جنگ کے قریب جانے کا خیال گناہ سمجھتے تھے۔" اپنے نقطۂ خیال کو قوی تر بنانے کے لئے گاندھی جی نے طرح طرح کے استدلال پیش کئے اور مجھے اپنا ہموا بنانے کے لئے زور ڈالا، لیکن میں ان سے متفق نہ ہو سکا۔ اہنسا میرے لئے عقیدے کی نہیں، بلکہ حکمت عملی کی بات تھی۔ میرا خیال تھا کہ آزادی حاصل کرنے کی اگر کوئی راہ نہ رہے تو ہندستان کو تلوار اُٹھانے کا بھی حق ہے۔

اس سوال پر مجلس عاملہ دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ابتدا میں جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راجہ جی، اور خان عبدالغفار خان میرے ہم خیال تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، آچاریہ کرپلانی اور شنکر راؤ دیو، گاندھی جی کے ساتھ تھے۔"

رہائی کے بعد جب مجلس عاملہ کا جلسہ کیا تو ان کو اندازہ ہوا کہ گاندھی جی سے ان کے جو اختلافات تھے وہ اب وسیع تر ہو چکے ہیں۔" اب تک ہم لوگوں کے اختلافات اصولی تھے۔ اب اندازہ ہوا کہ صورت حال کو سمجھنے میں بھی ہم لوگ متفق نہ تھے۔ گاندھی جی کو یقین تھا کہ ہندستان اگر جنگ میں امداد کے لئے مستعد ہو جائے، تو انگریز ہندوستان کو آزادی دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ برطانوی حکومت ہندستان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے یقیناً بے چین ہے۔ لیکن ہندستان کو آزادی دینے پر راضی نہیں ہے۔"

مولانا کا خیال یہ تھا کہ لڑائی کے زمانے میں برطانوی حکومت زیادہ سے زیادہ وہ اس پر تیار ہوئی کہ وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل میں ممبروں کی تعداد بڑھا کر ان میں کانگریس کو بھی نمائندگی دے دی جائے۔ طویل بحث اور تبادلۂ خیال کے بعد بھی مولانا اور گاندھی جی، ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکے۔

مارچ ۱۹۴۲ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستانی لیڈروں سے گفت و شنید کرنے کے لئے سر اسٹفورڈ کرپس کو ہندستان بھیجا۔ یہ اقدام دراصل نتیجہ تھا پریسیڈنٹ روزویلٹ اور جنرل چیانگ کائی شیک کے دباؤ کا۔ مولانا نے اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے کہ کرپس سے گفت و شنید کے لئے کانگریس نے مولانا کو اپنا واحد نمائندہ منتخب کیا۔ اہنسا اور جنگ میں شرکت کے تضاد سے کرپس خوبی واقف تھے۔ اس سوال پر گاندھی جی اور مولانا کے جو خیالات تھے ان سے بھی کرپس ناآشنا نہ تھے، چنانچہ مختلف ملاقاتوں کے دوران میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے ایک سے زیادہ بار یہ سوال اُٹھایا کہ جنگ کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات تو معلوم عوام ہیں اور ان خیالات کے ساتھ تو برطانوی حکومت سے کسی سمجھوتے کی مشکل ہی سے امید ہو سکتی ہے۔ میرے خیالات بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھے اور ان کی بنیاد پر گفت و شنید کا امکان تھا۔ انھوں نے (کرپس نے)، مجھ سے سوال کیا کہ میں اس کا وعدہ کر سکتا ہوں یا نہیں، کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کو اگر تسلیم کر لیا تو ہندوستانی قوم گاندھی جی کے بجائے میرے خیالات کو قبول کرے گی؟ میں نے کہا، کہ ہم سب گاندھی جی کی بے حد عزت کرتے ہیں، اور ان کی باتوں کو بڑے احترام سے سنتے ہیں، لیکن مجھے پورا اطمینان ہے کہ اس معاملے میں، کانگریس اور ملک دونوں کی اکثریت میرا ساتھ دے گی۔ انھوں نے یہ بھی سوال کیا کہ اس صورت حال میں کیا ہندستان جبریہ فوجی بھرتی کو قبول کرے گا؟ میں نے اس کا جواب دیا کہ ہم سب اس کو خوش آمدید کہیں گے، اور اس کی کوشش کریں گے کہ ہندستان کُلّی امداد کرے۔"

سر اسٹیفورڈ کرپس سے سمجھوتہ نہ ہو سکا، جس کی تفصیلات عام ہیں۔ کرپس نے اور ان کے خیالات سے ہندوستان بخوبی واقف تھا

کیا گیا۔ اس موقع پر مولانا اور کبیر صاحب نے مل کر اس پر نظرثانی کی اور اس کے ایک ایک باب اور ایک ایک جملے کو غور سے پڑھا" تا آنکہ "اس سال یومِ جمہوریہ کے موقع پر ـــ یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۸ء کو فالج کے مہلک حملے سے چند روز پہلے، مولانا نے فرمایا کہ وہ دستی مسودے سے کلی طور پر مطمئن ہیں اور اس کو پریس کے حوالے کیا جا سکتا ہے"

کتاب کا پہلا باب، جو نسبتاً بہت مختصر ہے، ابتدائی حالات پر مشتمل ہے۔ اردو داں طبقہ ان حالات سے بہت حد تک واقف ہے۔ یہ باب ہماری معلومات میں صرف اس قدر اضافہ کرتا ہے کہ تقسیم بنگالہ (۱۹۰۵ء) کے بعد بنگال میں جو دہشت انگیز جماعت پیدا ہو گئی تھی، مولانا نے اس گروہ سے راہ و رسم پیدا کی اور یہی ان کا پہلا سیاسی مکتب تھا۔ "شیام سندر چکرورتی نے جب دوسرے انقلابیوں سے میرا تعارف کرایا"، مولانا لکھتے ہیں۔

"اور ان کو معلوم ہوا کہ میں بھی اس جماعت کا ممبر بننا چاہتا ہوں، تو ان کو بڑی حیرانی ہوئی۔ ابتدا میں ان کو مجھ پر بھروسہ نہ تھا، چنانچہ اپنی اندرونی کارروائی کے جلسوں سے مجھ کو الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی غلطی محسوس کی اور میں نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا۔ میں نے ان کو بتلایا کہ ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مسلمان بحیثیت الجماعت ان کے دشمن ہیں، اور بنگال کے مسلمان افسروں کو دیکھ کر مسلمانوں کے رجحانات کا ان کو فیصلہ کرنا چاہیے۔"

جون ۱۹۱۲ء میں مولانا نے کلکتے سے الہلال کا اجرا کیا، اور الہلال ہی کی وساطت سے پہلے پہل ہندوستان کی علمی، ادبی، سیاسی اور صحافتی دنیا سے وہ روشناس ہوئے۔ الہلال کا اجرا بقول مولانا آزاد۔

"اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نیا موڑ تھا اور جلد ہی اس نے مثالی ہردلعزیزی حاصل کر لی۔ اخبار کی ترتیب و طباعت کی خوبیوں سے زیادہ اس کے اسلوب کے انتہاپسند قوم پرورانہ جذبات کی صدائے بازگشت نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اسی نے مسلمانوں کے جذبات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔"

خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کا اجمالی ذکر کرنے کے بعد کتاب کا اصل حصہ "میں کانگریس کا صدر منتخب ہوا" سے شروع ہوتا ہے۔

"۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں جنگ کا آغاز ہوا۔ اور مہینہ ختم ہونے سے قبل پولینڈ نے جرمن ہتھیاروں کے آگے سپر ڈال دی۔ پولینڈ کی مقاومت کے خاتمے کے ساتھ ہی یورپ پر ایک طرح کا پریشاں کن سکوت چھا گیا۔ فرانس و جرمنی اپنی اپنی قلعہ بند سرحدوں سے ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے لیکن بڑے پیمانے پر جنگ ملتوی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر شخص کسی بات کے ظہور کا منتظر تھا لیکن سب کے دعوے غیر واضح اور مبہم تھے۔

ہندوستان میں بھی ہر وقت امید و بیم کی سی کیفیت چھائی تھی۔ اس غیر یقینی اور پُرآشوب پس منظر میں کانگریس کی صدارت کے مسئلے نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ پچھلے کئی برسوں سے عہدہ قبول کرنے کے لئے مجھے مجبور کیا جا رہا تھا۔ لیکن مختلف وجوہ سے میں نے اس عہدہ کو قبول نہیں کیا تھا لیکن اب میں نے محسوس کیا کہ حالات بہت مختلف ہیں اور اس وقت عہدے کو قبول کرنے سے انکار فرض کی ادائیگی سے کوتاہی ہوگی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اب جب کہ جنگ شروع ہو چکی ہے، ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کا ساتھ دینے سے نہ ٹلنا چاہیے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ غلام ہندوستان دوسروں کی آزادی کے لیے کیوں کر لڑ سکتا تھا؟ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کا اگر فوری اعلان کرے تو ہندوستان کا یہ فرض ہوگا کہ آزادی کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دے۔ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ جنگ کے اس بحرانی دور میں مجھے ہر اس ذمہ داری کو قبول کرنا چاہیے جو میرے سامنے پیش کی جائے، چنانچہ جب گاندھی جی نے مجھ سے دوبارہ درخواست کی تو میں نے اس کو قبول کر لیا۔"

مارچ ۱۹۴۰ء میں مولانا آزاد مرحوم نے رام گڑھ کانگریس کی صدارت کی اور ابھی اپنی مجلس عاملہ کی پوری تشکیل بھی نہ کر سکے تھے کہ دوسرے لیڈروں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ جون ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کیا اور اس کے بعد ہی جاپان بھی جنگ میں

تو یقیناً تحریک شروع کرنے کا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس حالت میں لیڈروں کی گرفتاری کے بعد عوام نہ آسانی رسل و رسائل کا سلسلہ درہم برہم کر سکتے تھے اور روحی دجیروں کو آگ لگا سکتے تھے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ یہ صورتِ حال ایک ایسا تعطل پیدا کر دے گی کہ انگریز مصالحت پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ یقیناً بہت بڑا خطرہ تھا اور میں سمجھتا تھا کہ اگر خطرے کو مول لینا ہے تو آنکھیں کھول کر یہ قدم اُٹھانا چاہیئے۔"

ان اختلافات نے بڑی نازک صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ اس سلسلے میں مولانا نے گاندھی جی اور اپنے تعلقات کے سلسلے میں ایک انکشاف کیا ہے، جس کا اب تک بہت کم لوگوں کو علم تھا۔

مولانا اور جواہرلال سے کانگریس چھوڑ دینے کا گاندھی جی کا مطالبہ

"کانگرس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ۵ جولائی کو شروع ہوا تھا اس کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ پہلے بھی میرے اور گاندھی جی کے درمیان اختلافات مکمل تھے، ان حالات کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ گاندھی جی نے مجھے ایک خط لکھا کہ کانگرس اگر یہ چاہتی ہے کہ تحریک کی قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں رہے تو مجھے کانگرس کی صدارت، پیر مجلس عاملہ سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ اور جواہرلال نہرو کو بھی یہی کرنا چاہیئے۔"

میں نے فوراً جواہرلال کو بُلایا اور گاندھی کا خط ان کو دکھایا۔ اسی وقت اتفاقاً سردار پٹیل بھی آ گئے۔ اس خط سے سردار کو بھی بےحد دُکھ ہوا۔ وہ فوراً گاندھی جی کے پاس گئے اور ان کے اس اقدام کے خلاف سختی سے احتجاج کیا۔ سردار پٹیل نے کہا کہ اگر میں نے کانگرس کی صدارت سے استعفے دیدیا، اور میں اور جواہرلال مجلس عاملہ سے الگ ہو گئے تو ملک پر اس کے اثرات تباہ کن ہوں گے اور صرف یہی نہیں ہوگا کہ عوام اُلجھن میں پھنس جائیں گے، بلکہ کانگرس کی بنیادیں ہل جائیں گی۔"

"گاندھی جی نے یہ خط سات بجے صبح کو بھیجا تھا۔ دوپہر کو انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور ایک لمبی سی تقریر کی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ صبح کا خط لکھنے میں انھوں نے جلدی کی تھی، اور اب دوبارہ غور کرنے کے بعد اس کو واپس لینا چاہتے ہیں۔ ان کی عذرخواہی کے آگے سپر ڈالنے کے سوا میرے پاس کیا چارہ تھا۔ سہ پہر کو جب مجلس عاملہ کا جلسہ شروع ہوا تو پہلی بات گاندھی جی نے یہی کہی کہ "نادم گنہگار مولانا کی خدمت میں پھر حاضر ہے۔"

۱۲ جولائی ۱۹۴۲ء کو مجلس عاملہ نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز پاس کی۔ جس نے "سارے ملک میں برقی رو دوڑا دی۔ کسی نے بھی تجویز کے عواقب پر غور نہیں کیا اور ہر شخص یہ محسوس کرنے لگا کہ انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لئے کانگرس کوئی بڑی تحریک شروع کرنے والی ہے۔ حقیقت ہے کہ جلد ہی یہ تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" ہی کے نام سے مشہور ہو گئی۔

بالآخر اگست ۱۹۴۲ء کا وہ تاریخی دن آ گیا، جس نے ہندوستان کی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ اگست کے پہلے ہفتے میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ جس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تجویز کی توثیق کی۔ ۸ اگست کی شام کو یہ قصہ طے ہوا اور ۹ کی صبح کو کانگرس کی مجلس عاملہ اور دوسرے تمام لیڈروں کو بمبئی میں، اور بمبئی کے باہر گرفتار کر لیا گیا۔ گاندھی جی اور ان کے چند رفقا کو پونا کے آغا خاں پیلس میں اور مولانا اور مجلس عاملہ کو احمد نگر کے قلعے میں رکھا گیا۔ ۱۹۴۲ء کے اوائل میں گاندھی جی نے اکیس دن کا برت رکھا۔ اس کے کچھ دن بعد گاندھی جی کو رہا کر دیا گیا۔

رہائی کے کچھ دنوں کے بعد جب گاندھی جی کی صحت کچھ بہتر ہوئی تو انھوں نے سیاسی اقدامات شروع کئے اور اسی سلسلے میں انھوں نے مسٹر جناح سے ملاقات کی۔ کتاب کا اصل حصہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ یہیں سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے، جہاں تک مسلم لیگ اور مسٹر جناح کا تعلق ہے، ایک طرف گاندھی اور ان کے رفقا رہے اور دوسری طرف مولانا اور نیشنلسٹ مسلمان تھے، اور دونوں کے زاویۂ نگاہ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس جگہ یہ بات صاف کر دینا ضروری ہے کہ مولانا مرحوم نے نیشنلسٹ مسلمانوں کا نام نہیں لیا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے جو نقطۂ نگاہ پیش کیا، وہی نیشنلسٹ مسلمانوں کے بھی خیالات تھے۔ افسوس ہے کہ بہت سے واقعات اس کتاب میں بار نہ پا سکے، جن سے اس موضوع پر مزید روشنی پڑتی لیکن مولانا مرحوم، اس کتاب کو تین جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے، کیونکہ اسی کتاب

چونکہ ہر شخص ان کو ہندوستان کا دوست اور بہی خواہ سمجھتا تھا، اس لئے سب کو اُمید تھی کہ اس مرتبہ ہندوستان و برطانیہ میں سمجھوتہ ضرور ہو جائے گا۔ چنانچہ کرپس کی ناکامی نے ملک کے طول و عرض میں غم و غصّے کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ مولانا کی رائے تھی کہ سول نافرمانی کی تحریک فوراً شروع کر دی جائے۔ لیکن گاندھی جی کا خیال تھا کہ اس وقت اگر کوئی تحریک شروع کی گئی تو وہ متشددانہ رنگ اختیار کر لے گی اور وہ ان کے قابو سے باہر ہو جائے گی۔"

مولانا نے لکھا ہے کہ۔

حقیقتاً بڑی مشکل سے میں نے گاندھی جی کو انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک پر آمادہ کیا اور اس کے لئے بھی انھوں نے یہ شرطیں لگائیں کہ یہ تحریک اخلاقی مظاہرے سے آگے نہ بڑھے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جاپان کی فوجیں آسام کی سرحد پر دستک دے رہی تھیں، مولانا محسوس کر رہے تھے، کہ ہندوستانی حکومت بھی خطرے کو محسوس کر رہی ہے۔ عوام بھی جاپانی حملے کے متوقع تھے "گاندھی جی کو میں نے تمام حالات سے مطلع کیا۔" مولانا لکھتے ہیں:۔

اور یہ بھی بتلایا کہ میرا عقیدہ ہے کہ جاپانی فوجیں جوں ہی ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھیں، یہ ہمارا فرض ہوگا کہ ہر طرح سے ان کا مقابلہ کیا جائے گا۔ پرانے آقاؤں کی جگہ پر نئے آقاؤں کو قبول کرنے کا خیال میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ جاپان جیسے نوخیز سامراج کا اُکھاڑ پھینکنا ہمارے لئے بے حد دشوار ہوگا۔

"جاپانی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے میں نے پہلے ہی اقدامات شروع کر دیئے تھے۔ اس سلسلے میں رائے عامہ پیدا کرنے کے لئے میں نے کانگریس کو واضح ہدایت جاری کر دی تھیں اور کلکتے کو میں نے مختلف وارڈوں میں بانٹ دیا تھا تاکہ آسانی سے والنٹیر بھرتی کئے جا سکیں جو جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کا عہد کریں، میری رائے یہ بھی کہ کلکتے پر جاپانی حملے کے بعد برطانوی فوجیں جوں ہی پیچھے ہٹیں اور بہار کی طرف پسپا ہوں کلکتے میں جاپانی اقتدار قائم ہونے سے پہلے ہی کانگریس ان والنٹیروں کی مدد سے انتظام سنبھال لے کیونکہ اسی طرح ہم نئے حکمرانوں کا مقابلہ کر کے آزادی حاصل کر سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مئی اور جون ۱۹۴۲ء کے دونوں مہینے میں نے اس نئی اسکیم کو بروئے کار لانے کے انتظامات میں صرف کئے۔

"یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ گاندھی جی مجھ سے متفق نہ تھے۔ انھوں نے مجھے واضح الفاظ میں بتلایا کہ جاپانیوں نے اگر ہندوستان پر حملہ کیا تو یہ ہماری دشمنی میں نہیں بلکہ برطانیہ کی دشمنی میں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ انگریز اگر ہندوستان سے چلے جائیں تو جاپان ہندوستان پر حملہ نہ کرے گا۔ میں نے دیکھا کہ سردار پٹیل کے بھی یہی خیالات تھے۔ اور غالباً گاندھی جی کے خیالات پر بھی وہی اثر انداز ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ جب جدا ہوئے تو ایک دوسرے سے متفق نہ تھے۔"

"ہندوستان چھوڑ دو"

جولائی ۱۹۴۲ء کے پہلے ہفتے میں مجلس عاملہ کا واردھا میں جلسہ ہوا۔ "اس موقع پر گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلانے کا پہلی بار مجھ سے ذکر کیا۔ اس نئے خیال کو میں آسانی سے قبول نہ کر سکا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم عجیب مخمصے میں پھنسے ہیں، ہماری ہمدردیاں تو اتحادیوں کے ساتھ تھیں لیکن انگریزوں نے جو روش اختیار کی تھی، اس سے ان کے ساتھ ہمارا تعاون ناممکن بنا دیا تھا۔

"مجھے اس کا قطعی یقین تھا کہ موجودہ حالات میں عدم تشدد کے اصولوں کے مطابق اس وقت کوئی تحریک نہیں چلائی جا سکتی۔ کیونکہ تحریک اسی وقت عدم تشدد کے ساتھ چل سکتی ہے جبکہ لیڈر جیل سے باہر ہوں اور تحریک کی رہنمائی کر سکیں۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ جوں ہی تحریک شروع کرنے کا نام لیا گیا، سارے لیڈر گرفتار کر لئے جائیں گے کانگریس عدم تشدد کے اصول کو اگر چہ یاد رکھے

کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا۔ اور اس نے شملہ کانفرنس کے لئے مولانا آزاد مرحوم ہی کو اپنا نمائندہ بنایا۔ سابقہ کانفرنسوں کی طرح شملہ کانفرنس بھی ناکام رہی۔ لیکن "یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی سیاسی گفت و شنید ہندوستان و برطانیہ کے بنیادی اختلافات کی وجہ سے نہیں، بلکہ ہندوستانی جماعتوں کے فرقہ وارانہ اختلافات کی وجہ سے ناکام ہوئی تھی۔"

ناکامی کا اصل سبب یہ تھا کہ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے لئے کانگریس صرف ہندو ممبروں کو نامزد کرے۔ مسلمانوں کو نامزد کرنے کا حق صرف مسلم لیگ کو ہو، مولانا نے کانفرنس سے معقول سوال کیا تھا کہ "مسلم لیگ کو مطالبہ کرنے کا کیا حق ہے کہ کانگریس فلاں کو نامزد کرے اور فلاں کو نہ کرے۔"

کچھ عرصے کے بعد برطانیہ میں عام انتخابات ہوئے اور ان کے نتیجے میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آئی۔ مولانا نے مسٹر اٹیلی اور کرپس دونوں کو مبارکباد کے تار دیئے اور ان کو ان کے وعدے یاد دلائے۔ اس کا انھوں نے ہمت افزا جواب دیا۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اس میں شامل تھے۔

"میں محسوس کر رہا تھا" مولانا لکھتے ہیں :۔

"اس وقت اہم ترین سوال برطانیہ و ہند کے سیاسی مسائل نہیں، بلکہ، فرقہ وارانہ مسئلہ ہے شملہ کانفرنس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ سیاسی مسائل کے حل ہونے کی منزل تک ہم پہنچ چکے ہیں لیکن فرقہ وارانہ سوال اب تک ناحل تھا جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا، بلاشبہ مسلمان من حیث الجماعت اپنے مستقبل کے لئے پریشان تھے۔ یہ سچ ہے کہ بعض صوبوں میں ان کی اکثریت تھی۔ جہاں ان کے لئے کوئی دشواری نہ تھی لیکن سارے ہندوستان میں وہ اقلیت میں تھے اور یہ خطرہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں ان کی حیثیت کہیں غیر محفوظ نہ ہو۔

"ان مسائل پر میں نے مسلسل اور بے چینی سے غور کیا تھا اور اس نتیجے پہنچا تھا کہ ساری دنیا میں عام رجحان یہ ہے کہ مرکز کو کم سے کم اقتدار حاصل ہو، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف زبانیں بولنے والے آباد ہوں اور جہاں مختلف رسم و رواج اور مختلف جغرافیائی حالات پائے جاتے ہوں، وہاں کے لئے وحدانی طرز کی حکومت نامناسب ہے۔ ایسی وفاقی حکومت جس میں مرکز کے اختیارات محدود ہوں، وہ اقلیت کے شکوک کو بھی بڑی حد تک رفع کر سکتی ہے یہ دستور اس طرح مرتب کیا جائے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ معاملات میں خود مختاری حاصل ہو۔ صوبوں کی خود مختاری کے ساتھ ساتھ ہم کو قومی یکجہتی کو بھی برقرار رکھنا تھا اس کا صرف یہی ایک حل تھا کہ مرکز اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات اور ان کے دائرۂ عمل کا کوئی قابلِ قبول حل ڈھونڈ نکالا جائے۔"

اس سلسلے میں مولانا اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ صرف دفاع، رسل و رسائل اور غیر ملکی معاملات مرکز کے پاس رہیں اور باقی تمام مسائل صوبوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔

مولانا کا خیال تھا کہ ہندوستانی مسائل کا حل صرف اسی صورت سے ممکن ہے، صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دے دی جائے۔ اور مرکز کے پاس کم سے کم معاملات رہیں۔ مسلم اکثریت کے صوبے بھی اسی طرح مطمئن ہو سکتے تھے اور اسی طرح مسلمانوں کے دلوں سے ہندو اکثریت کے اقتدار کا ڈر بھی دور ہو سکتا تھا۔ بالآخر کیبنٹ مشن نے اس تجویز کو تھوڑے سے اصلاح کے ساتھ اپنا لیا۔

۶ر جون ۱۹۴۶ء کو مولانا نے کیبنٹ مشن کے ممبروں سے ملاقات کی۔ ان لوگوں نے کچھ سوالات مرتب کر رکھے تھے ان میں پہلا سوال فرقہ وارانہ مسئلہ سے متعلق تھا۔ اس کے جواب میں مولانا نے اپنی متذکرہ بالا اسکیم پیش کی۔ اس کونسل کے ایک ممبر نے کہا کہ فرقہ وارانہ سوال کا آپ حقیقتاً ایک نیا حل پیش کر رہے ہیں

میں جا بجا ہم کو یہ جملے نظر آتے ہیں کہ "اس مسئلے پر میں دوسری جلد میں بحث کروں گا" یا "اس کی تفصیلات میں بیان کروں گا"۔ آج جو کمی ہم محسوس کر رہے ہیں، ممکن ہے کہ مولانا آئندہ جلدوں میں وہ کمی پوری کر دیتے۔ مگر افسوس ہے کہ موت نے مہلت نہ دی اور ترجمان القرآن کی طرح وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے۔

گاندھی جی "جوں ہی رہا ہوئے" وہ لکھتے ہیں۔

"انھوں نے سیاسی اقدامات شروع کر دیئے۔ ان میں سے دو قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو انھوں نے مسلم لیگ سے مصالحت کرنے کی مہم شروع کی، اور مسٹر جناح سے ملاقات کا انتظام کیا۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ حکومت سے گفت و شنید شروع کرنے کی بھی انھوں نے کوشش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے پرانے اعلانات کے برعکس، لندن کے نیوز کرانیکل کے نامہ نگار کو یہ بیان دیا کہ اگر ہندستان کو آزادی دی جائے تو برطانیہ کی جنگی کوشش میں ہندستان دل و جان سے شریک ہوگا۔ ان کا یہ بیان پڑھ کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دونوں اقدامات قطعاً بے سود ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس موقع پر جناح کی طرف بڑھنا گاندھی جی کی بہت بڑی سیاسی غلطی تھی جس نے ان کی اہمیت بہت بڑھا دی، اور جس سے مسٹر جناح نے آگے چل کر پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ گاندھی جی نے شروع ہی سے مسٹر جناح کے متعلق غلط رویہ اختیار کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں مسٹر جناح نے جب کانگرس کو چھوڑا، تو ان کی سیاسی اہمیت ختم ہو گئی اور یہ گاندھی جی کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کا بڑی حد تک نتیجہ تھا کہ ہندستانی سیاسی زندگی میں انھوں نے اپنی اہمیت کو بحال کر لیا۔ گاندھی جی اگر یہ رویہ اختیار نہ کرتے تو مسٹر جناح شاید یہ فوقیت نہ حاصل کر سکتے۔ عام طور پر مسلمانوں کو مسٹر جناح اور ان کی پالیسی کی صحت پر بھروسہ نہ تھا لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ گاندھی اس طرح ان کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور اس طرح ان کی منت کر رہے ہیں تو بہتوں کے دلوں میں مسٹر جناح کے لئے ایک نئی عظمت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ حل کرانے میں یہ شخص زیادہ اچھا سودا کر سکتا ہے۔"

"یہاں میں صرف اس طرف اشارہ کروں گا کہ مسٹر جناح کو جو قائد اعظم کہا جاتا ہے اس لقب کو بھی سب سے پہلے گاندھی جی ہی نے استعمال کیا۔ گاندھی جی کے آشرم میں ایک سیدھی سادھی بیکل خاتون امتہ السلام تھیں۔ انھوں نے کسی اردو اخبار میں مسٹر جناح کے نام کے ساتھ قائد اعظم کا اضافہ دیکھا تھا۔ گاندھی جی مسٹر جناح سے ملنے کے لئے جب ان کو خط لکھنے لگے تو امتہ السلام نے کہا کہ اردو اخبار مسٹر جناح کو قائد اعظم لکھتے ہیں، اس لئے ان کو بھی یہی لقب استعمال کرنا چاہیئے۔ اس کے عواقب و نتائج پر بلا غور کئے ہوئے گاندھی جی نے مسٹر جناح کو قائد اعظم کہہ کر مخاطب کیا۔ یہ جلد ہی اخبار میں شائع ہو گیا۔ ہندستانی مسلمانوں نے جب دیکھا کہ گاندھی جی مسٹر جناح کو قائد اعظم لکھتے ہیں تو یقیناً وہ قائد اعظم ہی ہوں گے۔"

شملہ کانفرنس

۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو کانگرس کی مجلس عاملہ کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم بھی قید سے آزاد ہوئے۔ اس سے ایک دن پہلے لارڈ ویول نے ریڈیو پر اعلان کیا تھا کہ حکومت جلد ہی ہندستانی لیڈروں کی گول میز کانفرنس منعقد کرے گی تاکہ ہندستانی سیاسی جماعتوں سے گفت و شنید شروع کی جا سکے۔ نیز یہ کہ کانگرس کی مجلس عاملہ کو جلد ہی رہا کر دیا جائیگا تاکہ کانگرس کی کانفرنس میں حصہ لے سکے۔ یہ کانفرنس شملہ میں منعقد ہوئی۔

"دوبارہ صدارت قبول کرنے سے انکار کرنے میں شاید میں نے غلطی کی تھی، اور جو لوگ مجھے دوبارہ صدر منتخب کرنا چاہتے تھے انکی رائے صحیح تھی"۔

اسی سلسلے میں مولانا نے جواہرلال کی ایک اور غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس کو بیشتر صوبوں میں بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ یوپی میں بھی یہی حال تھا، لیکن وہاں اور صوبوں کے برعکس مسلم لیگ نے بھی ۲۶ نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ انتخابات کے بعد یہ طے پایا تھا کہ مسلم لیگ کے دو نمائندے — چودھری خلیق الزماں اور نواب محمد اسمٰعیل کو کانگریس وزارت میں لے لیگی۔ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک وزارت قبول نہیں کر سکتا تھا۔ آتے تو دونوں آتے، ورنہ کوئی ایک نہ آتا۔ مولانا کے بیان کے مطابق جواہرلال ان میں سے ایک کو لینا چاہتے تھے، اور انھوں نے یہی بات چودھری خلیق الزماں کو لکھ بھی دی۔ اور ان لوگوں نے وزارت میں شرکت سے انکار کر دیا۔ مولانا کا خیال ہے کہ اگر اس وقت یوپی میں مسلم لیگ کو وزارت میں شامل کر لیا گیا ہوتا، تو مسلم لیگ از سرِ نو زندہ نہ ہوتی۔

"ہندستانی سیاست کے جملہ طالب علم اس سے واقف ہیں"

مولانا لکھتے ہیں کہ:

"لیگ کی نئی تنظیم یوپی ہی سے شروع ہوئی تھی مسٹر جناح نے صورتِ حال سے پورا فائدہ اُٹھایا اور جارحانہ روش اختیار کی جس کا نتیجہ پاکستان ہوا"

جواہرلال کا جواب

مولانا کا یہ خیال ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن اس سلسلہ میں جواہرلال نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں یہ بالکل صحیح بات کہی ہے کہ:

"اگر یہ غلطی تھی، تو وہ تنہا اس کے ذمے دار نہ تھے یوپی کانگریس کے بہت سے لیڈر اور بھی تھے"

جن میں "پنتھ اور قدوائی" کا انھوں نے خاص طور سے نام لیا ہے جن کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔

جواہرلال نہرو کا یہ استدلال قوی ہے اس سلسلے میں اور بھی اُٹھائے ہیں جن کی طرف نہ تو مولانا نے اشارہ کرنا ضروری سمجھا اور نہ جواہرلال نے ان کا سہارا لینا ضروری سمجھا۔

اس جگہ ایک معاملے کی وضاحت کر دینا نامناسب نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ مولانا نے لکھا کہ یوپی میں مسلم لیگ نے ۲۶ نشستیں حاصل کی تھیں، اور دوسری بات اس سلسلے میں یہ بھی لکھی ہے کہ مسلم لیگ کو صرف اس وجہ سے یہ کامیابی نصیب ہوئی تھی کہ جمعیت العلمائے اس کی تائید و حمایت کی تھی۔ یہ اب سے بیس برس پہلے کا قصہ ہے اور جہاں تک یاد آتا ہے، یوپی میں مسلم جماعتوں کا ایک متحدہ پارلیمنٹری بورڈ بنا تھا، جس میں مسلم لیگ بھی شامل تھی، اور جمعیت العلماء بھی۔ اور یہ ۲۶ نشستیں مسلم لیگ نے نہیں، بلکہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے حاصل کی تھیں۔ اور جمعیت العلماء نے مسلم لیگ کی حمایت نہیں کی تھی، بلکہ پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کی کوشش کی تھی، اس لئے یہ کہنا غالباً صحیح نہیں ہے کہ جمعیت العلمائے مسلم لیگ کی حمایت کی تھی۔

بہرکیف یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا اخبارات نے مولانا کے حوالے سے جواہرلال نہرو کی، ان دونوں غلطیوں کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ مولانا کا خیال یہ تھا کہ جواہرلال نہرو کی یہی دونوں غلطیاں پاکستان کی تشکیل کا سبب ہیں۔ لیکن مولانا نے تقسیم کے اسباب کا جو تجزیہ کیا ہے۔ اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل ذمہ داری جواہرلال نہرو کے سر نہیں بلکہ سردار پٹیل کے سر ہے، جو کسی قیمت پر بھی ہوم کا محکمہ چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔

ان ٹیرم گورنمنٹ میں جب مسلم لیگ شرکت پر رضامند ہوئی تو لارڈ ویول نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کو ایک اہم وزارت دی جائے، اور ان کی رائے تھی کہ ہوم کا محکمہ ان کے حوالے کر دیا جائے مولانا اس رائے سے متفق تھے اور انھوں نے امکانی کوشش کی کہ یہ تجویز قبول کر لی جائے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ عنقریب جو وفاقی گورنمنٹ بننے والی ہے اس میں ہوم کا محکمہ صوبوں کی حکومت سے متعلق ہوگا اور مرکز سے اس کا تعلق اگر ہوا بھی تو برائے نام۔ اس سے اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی، مگر سردار نے ایک نہ سنی، بلکہ وہ استعفےٰ دینے کی دھمکی دینے لگے۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جب جلسہ ہوا اور مشن کی گفتگو کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے پہلی بار مولانا نے اپنے رفقاء کو اپنی تجویز سے آگاہ کیا، تو انھوں نے کیبنٹ مشن کے سامنے رکھی تھی، خاصی بحث و تمحیص کے بعد مجلس عاملہ نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور گاندھی جی نے اپنی پوری رضامندی کا اظہار کیا۔

کیبنٹ مشن نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنی اسکیم شائع کی جو لفظ بہ لفظ (A ، B اور C) مولانا ہی کی اسکیم تھی، اضافہ صرف اتنا تھا کہ اس نے ہندوستان کے صوبوں کو A ، B اور C ، تین منطقوں میں بانٹ دیا تھا۔ سندھ، پنجاب، سرحدی صوبہ اور بلوچستان B میں تھے اور بنگال و آسام C میں تھے یہ مسلم اکثریت کے علاقے تھے۔ کیبنٹ مشن کا خیال تھا کہ یہ تقسیم مسلمانوں کے شکوک رفع کر دے گی۔

ابتدا میں مسٹر جناح نے اس اسکیم کے ماننے سے سرے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ مسلم لیگ کونسل میں تین دن تک اس پر بحث ہوتی رہی۔ تیسرے دن مسٹر جناح کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ موجودہ حالات میں اقلیتوں کے مسئلے کا اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں ہو سکتا، جو کیبنٹ مشن نے پیش کیا ہے اور انھوں نے اس کو قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ مسلم لیگ کونسل نے اس اسکیم کو قبول کرنے کی بلا اختلاف رائے تجویز پاس کی۔

اب بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو گیا۔

جواہر لال کی غلطی اور مولانا آزاد

۱۹۳۹ء میں مولانا مرحوم کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ کانگرس کے دستور کے مطابق صدر کا ہر سال انتخاب ہوتا تھا، لیکن جنگ کے غیر معمولی حالات نے اس کا موقع نہ دیا کہ نیا صدر چنا جائے۔ اب جبکہ حالات معتدل ہو رہے تھے تو کانگرس کے لئے نئے صدر کے انتخاب کا بھی سوال تھا۔ کانگرس کا عام منشا یہ تھا کہ مولانا ہی کو دوبارہ صدر چن لیا جائے لیکن وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے جب مولانا نے قطعیت کے ساتھ انکار کیا تو ایک گروہ سردار پٹیل کو صدر چننے کے حق میں تھا۔ خود مولانا کی خواہش تھی کہ جواہر لال نہرو صدر چنے جائیں، اور بالآخر مولانا ہی کو کامیابی ہوئی۔

جواہر لال نے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد جب پہلی پریس کانفرنس کی تو اس موقع پر ایک اخبار نویس نے ان سے سوال کیا۔

"کانگرس نے کیبنٹ مشن کی اسکیم کو کیا غیر مشروط طور پر تسلیم کیا ہے؟"

اس کے جواب میں جواہر لال نہرو نے کہا۔

"کانگرس دستور ساز اسمبلی میں تمام معاہدوں سے آزاد ہو کر داخل ہو رہی ہے اور جو صورت حال پیدا ہوگی اس کا وہ مقابلہ کرے گی۔"

"عام حالات میں" بقول مولانا۔

"لوگ اس طرف دھیان بھی نہ دیتے، لیکن خوف و شبہات کے اس دور میں اس جواب سے نہایت افسوسناک نتائج برآمد ہوئے۔"

اس جگہ مولانا نے پُر زور انداز سے لکھا ہے کہ:

"میں یہ قلم بند کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جواہر لال کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہ تھا۔ یہ کہنا کہ مشن کی اسکیم میں ترمیم کرنے کا کانگرس کو اختیار تھا، صحیح نہ تھا"

جواہر لال نہرو کا یہ جواب" مسٹر جناح کے لئے بم کا گولہ ثابت ہوا۔ انھوں نے فوراً بیان دیا کہ "صدر کانگرس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگرس نے کیبنٹ مشن کی اسکیم کو غیر مشروط طور پر تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ نے بھی اپنی منظوری کی تجویز واپس لے لی۔

"اس نئی صورت حال سے میں انتہائی پریشان ہوا" مولانا فرماتے ہیں

جس اسکیم کے لئے میں نے انتھک کوشش کی تھی وہ ہماری ہی غلطی سے تباہ ہو گئی تھی۔"

اسی موقع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ مولانا نے لکھا ہے کہ۔

اس کا سردار پٹیل نے جو جواب دیا وہ حیرت ناک تھا۔

"ہم اس کو پسند کریں نہ کریں" سردار نے جواب دیا، "ہندوستان میں دو قومیں ہیں۔" ان کو اس کا یقین تھا کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے میں سمو کر ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا۔ اب اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دو بھائی بھی اگر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں تو الگ ہو جاتے ہیں۔ جب دونوں کو اپنے اپنے حصے الگ الگ مل جاتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ان کو زبردستی ایک ساتھ رکھا جاتا ہے تو آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں۔ روز کی توتو میں میں سے یہ اچھا ہے کہ یکبارگی کھل کر لڑ لیں اور الگ ہو جائیں۔"

اس کے بعد مولانا نے جواہر لال سے بات کی تقسیم کی بابت۔ میں جواہر لال نے سردار پٹیل جیسی باتیں تو نہیں کیں لیکن انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ تقسیم اصولاً غلط ہے لیکن ایگزیکیٹو کونسل میں مسلم لیگ کے ممبروں نے جو روش اختیار کی تھی اس نے جواہر لال کو سخت مایوس کیا تھا اور ان کو مسلم لیگ اور کانگریس کے متفق ہونے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ جواہر لال نے دکھ کے ساتھ مولانا سے سوال کیا کہ ان حالات میں آپ ہی بتلائے کہ سوائے تقسیم کے کیا چارہ ہے؟"

جواہر لال تقسیم کو اب بھی "بد تر" سمجھتے تھے، لیکن ساتھ ہی ان کو اس کا بھی یقین ہو چکا تھا کہ تقسیم کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے مولانا سے کہا کہ "جو بات ہونے والی ہے، آپ اس کی مخالفت نہ کیجئے، اور ماؤنٹ بیٹن کی اسکیم کی مخالفت ترک کر دیجئے۔"

مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے جواہر لال سے کہا کہ ان کے خیال سے میں متفق نہیں ہو سکتا ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہم یکے بعد دیگرے غلط قدم اٹھا رہے تھے، اور دلدل سے نکلنے کے بجائے ہم اس میں دھنسے جا رہے تھے۔ مسلم لیگ نے مشن کے منصوبے (فیڈریشن) کو قبول کر لیا تھا اور بظاہر ہندوستانی مسائل حل ہوتے معلوم ہوتے تھے، لیکن بدنصیبی سے حالات کا رخ بدل گیا اور مسٹر جناح کو مسلم لیگ کی سابقہ منظوری واپس لے لینے کا موقعہ مل گیا۔

"میں نے کہا کہ ہم سے دوسری غلطی اس وقت ہوئی، جب لارڈ ویول نے تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ کو ہوم کا محکمہ دیدیا جائے اس کو قبول کر لینے سے کوئی ایسی دشواری نہ پیدا ہوتی جس پر قابو نہ حاصل کیا جا سکتا۔ سردار پٹیل چونکہ ہوم کا محکمہ اپنے پاس رکھنے پر مصر تھے اس لئے ہم نے خود مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کے حوالہ کر دیا۔ اور یہی ہماری موجودہ دشواریوں کی جڑ ہے۔ میں نے جواہر لال کو متنبہ کیا کہ اگر ہم نے تقسیم کو قبول کر لیا تو تاریخ ہم کو کبھی معاف نہ کرے گی اور اس کا یہ فیصلہ ہو گا کہ کانگریس بھی تقسیم کی اسی قدر ذمہ دار تھی جتنی مسلم لیگ تھی۔"

"اب آخری آس گاندھی جی سے تھی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی آئے۔ سب سے پہلے مولانا ان کے پاس پہونچے۔ ان کو دیکھتے ہی گاندھی جی نے سوال کیا:۔

"پاکستان نے تو اب دھمکی کی شکل اختیار کر لی ہے
معلوم یہ ہوتا ہے کہ جواہر لال اور ولبھ بھائی
دونوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اب آپ کیا
کریں گے؟ آپ میرا ساتھ دیں گے، یا آپ بھی
بدل گئے؟"

"میں پہلے بھی تقسیم کا مخالف تھا، اور آج بھی اس کے خلاف ہوں" مولانا نے جواب دیا۔ "آج میں جس قدر تقسیم کا مخالف ہوں، اس درجہ تو میں پہلے بھی مخالف نہ تھا۔ مجھے تو اس کا دکھ ہے کہ جواہر لال اور سردار پٹیل نے ہار مان لی، یا آپ کے الفاظ میں ہتھیار ڈال دیئے۔ اگر آپ تقسیم کے خلاف کمربستہ ہو جائیں تو آج بھی ہم صورت حال کو پھر سنبھال سکتے ہیں لیکن اگر آپ نے بھی ہمت ہار دی، تو مجھے خطرہ ہے کہ ہندوستان کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

"یہ آپ کیا سوال کر رہے ہیں؟ اگر کانگریس

بالآخر جو یہ طے پایا کہ مال کا صیغہ مسلم لیگ کو دیدیا جائے۔ مولانا نے اس کی بھی بے حد مخالفت کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مسلم لیگ کو وزارتِ مال دینا انتہائی ناعاقبت اندیشی ہوگی۔ کیونکہ حکومت کی کنجی وزارتِ مال کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اس کی منظوری کے بغیر ایک چپراسی بھی ملازم نہیں رکھا جا سکتا اور چونکہ مسلم لیگ نیک نیتی اور اشتراک و تعاون کے جذبے کے ساتھ حکومت میں نہیں آ رہی ہے، اس لئے قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا ہوں گی، اور حکومت کی گاڑی چل ہی نہ سکے گی، اور یہی ہوا۔ کانگرس کی طرف سے جو تجویز بھی پیش کی جاتی، "لیاقت علی اسکو یا تو نامنظور کر دیتے یا توڑ مروڑ کر اس کو مسخ کر دیتے۔ ان کی پیہم مداخلت نے کانگرس کے ممبروں کے لئے مؤثر طریقے سے کام کرنا دشوار کر دیا۔" مولانا نے بار بار یہ بات واضح الفاظ میں لکھی ہے کہ سردار پٹیل ہوم کا محکمہ اپنے ہاتھوں میں رکھنے پر اس درجہ مصر نہ ہوتے تو حکومت کے لئے یہ ناقابلِ برداشت صورتِ حال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتی!

یہ حالات تھے جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن آخری وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آئے۔ برٹش گورنمنٹ نے انکو واضح طور پر ہدایت کی تھی کہ کسی قیمت پر بھی وہ ہندوستان کے مسائل حل کر دیں۔ انھوں نے آتے ہی کانگرس اور مسلم لیگ کی اندرونی کشمکش کی گہرائی کا صحیح اندازہ لگا لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تقسیم ہی ان سارے مسائل کا حل ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو بھی بخوبی سمجھ لیا تھا کہ لیاقت علی خاں نے سردار پٹیل کو اس درجہ ناکوں چنے چبوائے ہیں کہ وہ کسی قیمت پر بھی مسلم لیگ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے خواہش مند تھے، چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کی تجویز سب سے پہلے سردار پٹیل ہی کے سامنے پیش کی اور انھوں نے بآسانی سردار پٹیل کو ہموار کر لیا۔

سردار پٹیل کو ہموار کر لینے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے جواہر لال کی طرف رخ کیا۔ ابتدا میں تو جواہر لال اس کو سننے ہی کے لئے تیار نہ تھے اور تقسیم کے تصور ہی کا ان پر شدید ردِ عمل ہوا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے ہمت نہ ہاری اور آہستہ آہستہ ان کے ذہن کو ہموار کرتے رہے۔ "لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان وارد ہونے کے ایک مہینے کے اندر تقسیم کے پُرزور حریف جواہر لال تقسیم کے اگر حامی نہ بھی ہوں تو اس کے تصور سے متنفر نہ رہے۔

"مجھے اکثر حیرت ہوئی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواہر لال کو کس طرح رام کر لیا۔ جواہر لال بڑے اصولی آدمی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ اضطراری طبیعت کے بھی مالک ہیں، اور اثر پذیری کا بھی ان کے اندر مادہ ہے۔ سردار پٹیل کی دلیلوں کا بھی کچھ نہ کچھ ان پر اثر ہوا ہوگا۔ لیکن یہ فیصلہ کن نہیں ہو سکتا تھا۔ جواہر لال ماؤنٹ بیٹن سے بہت متاثر تھے، لیکن ان سے بھی زیادہ شاید لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے ان کو متاثر کیا تھا۔ وہ انتہائی ذہین ہی نہیں ہیں بلکہ دلآویز اور دوستانہ افتادِ طبیعت کی بھی مالک ہیں وہ اپنے شوہر کی بیحد گرویدہ ہیں۔ اور اکثر حالتوں میں ان کے خیالات کی ایسے لوگوں سے تشریح کرنے کی بھی کوشش کرتی تھیں جو ان سے متفق نہ ہوتے تھے۔"

لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے بعد "دوسرے صاحب جو جواہر لال پر اثر انداز ہوئے وہ کرشنا مینن تھے۔ کرشنا مینن جواہر لال کے مداح ہونے کے مدعی تھے اور جواہر لال انکی باتوں پر اکثر کان بھی دھرتے تھے، یہ بات مجھے کچھ پسند نہ تھی۔ کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ جواہر لال کو وہ اکثر غلط مشورے دیتے تھے میں اور سردار پٹیل اکثر معاملوں میں ایک دوسرے سے اتفاق نہ کرتے تھے، لیکن کرشنا مینن کے باب میں ہم لوگ متفق تھے۔ بہرکیف اس مسئلے پر میں اپنے سوانح کی تیسری جلد میں بحث کروں گا"

جب مولانا کو پتہ چلا کہ جواہر لال نے تقسیم کے آگے سپر ڈال دی ہے تو قدرتاً ان کو پریشانی ہوئی۔ انھوں نے سردار اور جواہر لال دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ سردار تو کچھ سننے کے لئے سرے سے تیار ہی نہ تھے۔ میں نے گھنٹے بھر تک انکو سمجھایا کہ اگر تقسیم کو ہم نے مان لیا تو ہندوستان کے لئے ہم ایک مستقل مسئلہ پیدا کر دیں گے۔ فرقہ وارانہ سوال تقسیم سے حل نہ ہوگا، بلکہ ملک کے لئے یہ ایک دائمی مصیبت بن جائے گا۔ دو قوموں کا نعرہ جناح نے لگایا ہے۔ اگر ہم نے تقسیم کو قبول کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس کو تسلیم کر لیا۔ ہندو مسلمانوں کی بنیاد پر کانگرس کیونکر ملک کو تقسیم کرنے پر رضامند ہو سکتی ہے؟"

کی کہ بہت بڑھا چڑھا کر اس سے حزیں بیان کی جاتی ہیں، بلکہ پٹیل نے یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کو شکایت کی یا خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار ہم تینوں آدمی گاندھی جی کے پاس بیٹھے تھے۔ جواہرلال نے انتہائی کرب کے ساتھ کہا کہ دلّی کی صورتِ حال ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ جہاں مسلمان شہری کتّے بلّی کی طرح مارے جا رہے ہیں اور اُن کو شرم آتی ہے کہ وہ بے بس ہیں اور اُن کو بچا نہیں سکتے۔ ان کا ضمیر ان کو بے چین کر رہا ہے کہ اِن ہولناک واقعات کے متعلق لوگ سوال کریں گے تو وہ کیا جواب دیں گے؟

جواہرلال نے یہ بات کئی بار دُہرائی کہ صورتِ حال اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ہے اور یہ کہ ان کا ضمیر ان کو چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔

"سردار پٹیل پر ان باتوں کا ردِّ عمل دیکھ کر ہم لوگ حیران رہ گئے۔ عین اس وقت جبکہ دن دہاڑے دہلی میں مسلمان قتل کئے جا رہے تھے، انھوں نے پُرسکون لہجے میں گاندھی جی سے کہا کہ جواہرلال کی شکایتیں ان کے لیے قطعًا ناقابلِ فہم ہیں ہوسکتا ہے کہ اکّا دُکّا وارداتیں ہوتی ہوں، لیکن مسلمانوں کی جان و مال بچانے کی ہر امکانی کوشش گورنمنٹ کر رہی ہے، اور اس سے زیادہ کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ حقیقتًا انھوں نے (سردار پٹیل نے) اس بات پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا کہ وزیرِاعظم ہونے کے باوجود جواہرلال اپنی ہی حکومت کی کارروائیوں سے بے اطمینانی کا اظہار کر رہے ہیں۔

"چند لمحوں تک جواہرلال پر سکتہ طاری رہا، پھر یاس کے ساتھ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ اگر سردار پٹیل کے یہی خیالات ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔"

اس سلسلے کے متعدد واقعات و مشاہدات مولانا نے قلمبند کئے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے اور جن سے اندازہ ہوتا ہے، دہلی کی صورت حال جواہرلال اور گاندھی جی دونوں کے دل و دماغ پر بُری طرح اثرانداز ہورہی تھی۔ اس سلسلے کا نقطۂ عروج گاندھی جی کا برت تھا۔

مولانا کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی کا یہ برت دراصل سردار پٹیل کی روش کے خلاف احتجاج تھا۔ "گاندھی جی کے دل و دماغ پر سردار پٹیل کا رویہ بُری طرح اثرانداز ہوا تھا۔ سردار پٹیل گاندھی جی کے اندرونی حلقے کے آدمی تھے اور گاندھی جی کو بے حد عزیز تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سردار پٹیل کا سارا سیاسی وجود گاندھی جی ہی کا رہینِ منت تھا کانگرس کے اہم لیڈروں میں بیشتر لوگ تو وہ تھے جو گاندھی جی سے پہلے ہی اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کر چکے تھے، لیکن سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد دو آدمی ایسے تھے جو کلیتًا گاندھی جی کے بنائے ہوئے تھے ... گاندھی جی نے اُن کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنوایا تھا اور انھیں کی وجہ سے ۱۹۳۱ء میں وہ کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ چنانچہ گاندھی جی کو اس سے بے حد دُکھ ہوا کہ اس وقت پٹیل نے ایسی پالیسی اختیار کی جو گاندھی جی کے تمام مقاصد کے منافی تھی

گاندھی جی نے کہا کہ دہلی میں ان کی آنکھوں کے سامنے مسلمان مارے جا رہے ہیں اور یہ اس وقت ہو رہا ہے جب کہ ولبھ بھائی جو ان کے اپنے آدمی ہیں۔ حکومتِ ہند کے ہوم منسٹر اور راجدھانی میں امن امان قائم رکھنے کے ذمے دار ہیں۔

گاندھی جی کو برت کے ارادے سے باز رکھنے کی لوگوں نے بے حد کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے ارادے سے دستبردار نہ ہوئے۔ بالآخر ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء سے گاندھی نے برت شروع کیا جس نے سارے ملک میں ہلچل مچا دی۔

برت کے پہلے دن شام کو مولانا، جواہرلال نہرو اور سردار پٹیل گاندھی جی کے پاس بیٹھے تھے "اسی روز رات کو سردار بمبئی جانے والے تھے۔ انھوں نے رسمی انداز سے گاندھی جی سے کہا کہ وہ بے سبب برت رکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس کی شکایت بھی کی کہ اس طرح کے برت کا کوئی محل ہی نہیں ہے۔ اس برت کا نتیجہ حقیقتًا یہ ہوگا کہ حکومت پر عمومًا اور سردار پر خصوصًا تہمتیں لگائی جائیں گی، انھوں نے کچھ تلخی کے ساتھ کہا کہ گاندھی جی کی کارروائی سے یہ مترشح ہوتا ہے مسلمانوں کے قتل کے ذمہ دار گویا سردار پٹیل ہی ہیں!"

گاندھی جی نے، اپنے مخصوص پُرسکون لہجہ میں اسکا جواب یہ دیا کہ۔

"میں چین میں نہیں بلکہ دہلی میں بیٹھا ہوں، اور اپنی

تقسیم کو قبول کرنا چاہتی ہے، تو تقسیم میری لاش پر ہوگی۔ جب تک میری جان میں جان ہے ہندستان بٹ نہیں سکتا۔ اگر میرا بس چلا تو میں کانگرس کو تقسیم قبول نہ کرنے دوں گا۔"

" گاندھی جی اسی دن ماؤنٹ بیٹن سے ملے اور پھر ۲ اپریل کو ان دونوں نے دو ملاقاتیں کی۔" اس ملاقات سے واپسی کے بعد ہی سردار پٹیل گاندھی جی کے پاس آئے۔ اور ان دونوں نے تقریباً دو گھنٹے تک علیحدہ باتیں کیں، ان دو گھنٹوں میں جو باتیں ہوئیں، ان کا مجھے کچھ علم نہیں ہے لیکن جب میں دوبارہ گاندھی جی سے ملا ہوں تو مجھے شدید ترین دھکا لگا، کیونکہ گاندھی بھی اب بدل چکے تھے، وہ اب بھی علانیہ تقسیم کے حق میں نہ تھے، لیکن تقسیم کی مخالفت میں ان کا لہجہ اب دھیما ہو چکا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ تکلیف اس بات سے ہوئی کہ تقسیم کی حمایت میں گاندھی جی بھی وہی دلیلیں پیش کر رہے تھے، جو سردار پٹیل نے پیش کی تھیں۔ دو گھنٹے تک میں ان کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن میری دلیلیں ان کو متاثر نہ کر سکیں۔"

" اگر آپ نے بھی یہ خیالات قبول کر لئے ہیں۔" مولانا نے گاندھی جی سے کہا " تو اب ہندستان کو تباہی سے بچانے کی کوئی شکل نہیں رہی۔"

مولانا کا یہ بیان بڑی حد تک صحیح ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کے پریس سکریٹری کیمپبل جانسن کی کتاب "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ۶ مئی ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی اور مسٹر جناح کی ملاقات ماؤنٹ بیٹن نے طے کرا دی اور اس ملاقات کے بعد ان دونوں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا، جس میں کہا گیا تھا کہ

> " ہم نے (گاندھی جی اور مسٹر جناح نے) دو مسائل پر گفتگو کی، ہندوستان کا بٹوارہ، ہندستان و پاکستان میں۔ مسٹر گاندھی تقسیم کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔" (ص ۹۵)

اس مشترکہ بیان سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس ملاقات میں گاندھی جی تقسیم کے اصول کو تو تسلیم نہیں کر سکے تھے، لیکن بٹوارے کی گفتگو کے لئے اپنے کو یقیناً آمادہ کر چکے تھے ؎

> اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

اُمید کی فریب کاری اور سراب آفرینی کی بھی ایک دلچسپ مثال اس کتاب میں ہم کو ملتی ہے۔ جس کا شکار خود مولانا ہوئے تھے۔ جواہر لال اور گاندھی جی سے مایوس ہونے کے بعد انھوں نے اس خیال سے اپنی امیدوں کو آخری سہارا دیا کہ انگلستان کی لیبر گورنمنٹ کیبنٹ مشن کی اسکیم کی منسوخی کو آسانی سے قبول نہ کرے گی۔" لیکن ؎

> آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

ماؤنٹ بیٹن نے لندن جا کر لیبر گورنمنٹ اور مسٹر چرچل سے مشورہ کیا۔ ۳۰ مئی ۱۹۴۷ء کو دہلی واپس لوٹے۔ ۲ جون کو کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں سے گفتگو کی اور ۳ جون ۱۹۴۷ء کو انھوں نے اپنی اسکیم کا، جو تقسیم کی اسکیم تھی، اعلان کیا۔ اس اعلان نے تمام اُمیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ تقسیم کی اسکیم کو لیبر گورنمنٹ نے جن اسباب کی بنا پر قبول کیا تھا ان کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لیبر گورنمنٹ نے ہندستان کے مفاد کو پس پشت ڈال کر برطانوی سامراجی مفاد کو پیش نظر رکھا تھا، اس معاملے میں مشکل ہی سے کوئی شخص مولانا سے اختلاف کر سکتا ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بالآخر وطن عزیز تقسیم ہوا، اور ہندستان و پاکستان کی آزاد مملکتیں وجود میں آئیں۔ گاندھی جی اور جواہر لال کے دل و دماغ پر اس عمل جراحی کے ہولناک نتائج جس طرح مترتب ہوئے ان کا بھی مولانا نے اجمالی ذکر کیا ہے۔ نیز اس کتاب سے اس کا بھی دستاویزی ثبوت ملتا ہے کہ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں مسلمانوں کی تباہیوں کا جہاں تک تعلق ہے سردار پٹیل کی معلومات مضحکہ خیز حد تک دل چسپ تھیں۔

" سردار پٹیل ہوم منسٹر تھے۔" مولانا لکھتے ہیں، اس لئے دہلی کا نظم و نسق براہ راست ان سے متعلق تھا۔ قتل و غارت کی فہرست جب طویل ہونے لگی تو، گاندھی جی نے سردار پٹیل کو بلایا اور پوچھا کہ اس کشت و خون کو روکنے کے لئے وہ کیا کر رہے ہیں؟ سردار پٹیل نے یہ کہہ کر گاندھی جی کو مطمئن کرنے کی کوشش

......یادِ رفتگاں

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا، غالب کو تو صرف اپنی شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

با اینہمہ بار از جہاں حسن وفا
رونقِ بزم و ارباب دکاں رستم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے، مذہب، علوم و فنون، ادب، انشاء، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدأ فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں۔ اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامن دل مالا مال نہ ہوتا رہتا ہو۔ بحمد للہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں ———— لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اس نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا ————"

ابوالکلام

انتخاب از مکتوب بنام غلام رسول مہر
مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۳۶ء بمقام کلکتہ

آنکھ اور کان کی شہادت پر اعتماد نہ کروں؟ اور تم مجھ سے یہ کہو کہ مسلمانوں کی شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہے، تو میں یقیناً تم کو تو ایسا ہم خیال بنا سکوں گا اور تم بھی مجھ کو قائل نہ کر سکو گے۔ ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں اور میرے گوشت پوست ہیں، غصے نے ان کو اندھا کر دیا ہے، اس لئے میں ان کو الزام نہیں دے سکتا۔ سوا اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں تکلیف و دُکھ برداشت کر کے ان کے ضمیر کو بیدار کروں۔ مجھے امید ہے کہ میرا برت ان کی آنکھیں کھول دے گا۔"

"سردار پٹیل بلا کچھ جواب دیئے کھڑے ہو گئے، جیسے وہ چلے جانا چاہتے ہوں۔ میں نے ان کو روک کر کہا کہ وہ بمبئی جانے کا پروگرام منسوخ کر دیں اور دہلی میں رہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ حالات کس وقت نازک صورت اختیار کر لیں اور گاندھی جی کے برت کے دوران میں ان کو دہلی ہی میں رہنا چاہیئے۔

"میرے ٹھہرنے سے کیا فائدہ" سردار نے چلا کر جواب دیا۔ "گاندھی جی میری بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ساری دُنیا کے سامنے ہندوؤں کے نام کو بٹہ لگانے کا انھوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر ان کا یہی رویہ ہے تو میں ان کے لئے بیکار ہوں میں اپنا پروگرام نہیں بدل سکتا اور بمبئی ضرور جاؤں گا۔"

گاندھی جی کے برت کے متعلق جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل کے تاثرات کے تضاد کا اندازہ ہم کو کیمبل جانسن کی متذکرہ بالا کتاب سے بھی ہوتا ہے۔ جس سے مولانا کے بیان کی تائید ہوتی ہے وہ لکھتا ہے کہ

"گاندھی جی کے برت رکھنے کے فیصلے کے متعلق دونوں (پٹیل اور نہرو) کے ردعمل ان کے انداز فکر کے تضاد کا بہترین عکس ہیں پٹیل نے شکایت کی کہ برت رکھنے کا انتہائی غلط وقت منتخب کیا گیا ہے اور مہاتما جی جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اسکو اس سے نقصان پہنچے گا نہرو اسکے برعکس گاندھی جی کے اس اقدام کی تعریف اور اس پر اپنی خوشی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے"

(۱۳ جنوری ۱۹۴۸)

گاندھی جی کے برت نے دہلی کی فضا بدل دی۔ بالآخر اسکے بعد گاندھی جی نے برت توڑا۔ گاندھی جی کی کامیابی نے انکے مخالفین کے اوسان کھو دیئے۔ برت توڑنے کے تیسرے دن شام کو پرارتھنا کے جلسے میں گولہ پھینکا گیا لیکن خوش قسمتی سے کوئی مجروح نہیں ہوا سی آئی ڈی، اور پولیس نہ تو اسکا پتہ چلا سکی کہ اسکا ذمہ دار کون تھا اور نہ آئندہ کے لئے مزید احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں، بالآخر مولانا لکھتے ہیں :-

"۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ڈھائی بجے، میں گاندھی جی کے یہاں گیا۔ کئی اہم معاملات پر مجھے ان سے گفتگو کرنی تھی۔ چنانچہ ایک گھنٹے سے زیادہ میں ان کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ ساڑھے پانچ بجے میں گھر واپس آیا۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ چند ضروری معاملات میں ان سے مشورہ کرنا بھول گیا تھا میں فوراً پھر برلا ہاؤس لوٹا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازے بند تھے، ہزار ہا آدمی لان پر جمع تھے اور مجمع سڑک تک پہنچ چکا تھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا لوگوں نے مجھے گاڑی میں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا چار دیواری کے دروازے پر گاڑی سے اُتر کر میں پیدل اندر گیا۔ اندر کے لوگوں میں سے کسی نے دروازے کے شیشے سے مجھے دیکھا اور دروازہ کھول کر مجھے اندر لینے کے لئے باہر آیا میں اندر داخل ہو ہی رہا تھا کہ کسی نے آنسو بھری آواز سے کہا کہ گاندھی جی کو کسی نے گولی ماری اور وہ بے ہوش پڑے ہیں۔

آخری صفحات میں مولانا نے کھلے لفظوں سردار پٹیل کو گاندھی جی کی جان کی حفاظت نہ کرنے کی کوتاہی کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اور اپنے اس خیال کی تائید میں انھوں نے دوسرے ذمہ دار لوگوں کے بیانات پیش کئے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس کتاب میں جتنی باتیں لکھی ہیں انمیں سے بیشتر باتیں پہلے بھی کچھ لوگوں نے کہی تھیں، لیکن انکی کوئی اہمیت نہ تھی اور مستقبل کا مورخ غالباً ان کو نظر انداز کرتا۔ لیکن مولانا مرحوم نے چونکہ یہ باتیں قلمبند کی ہیں اور ان کے بیانات ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب سے تیس، چالیس سال بعد جب سرکاری ریکارڈ ریسرچ کے لئے کھولے جائیں گے، تو مولانا کی یہ کتاب محققین کو تحقیق کی نئی راہیں دکھلائے گی اور یہی انکی کتاب کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا آئندہ نسلیں اس کا عقیدت مندی کے ساتھ اعتراف کریگی اور کہیں گی کہ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

•••

قطعاً غلط ہے۔ کہ میں نے اس کا جواب نہیں بھیجا جس دن وہ خط پہونچا ہے اسی دن میں نے جواب لکھا ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوسرے دن روانہ کر دیا ہے اور اگر جواب نہ ملنے سے مقصود یہ ہے کہ اس خط میں میں نے دہلی آنے اور آپ کو بذریعہ تار اطلاع دے کر بلوانے کا جو وعدہ کیا تھا اس میں تاخیر ہوئی تو اس میں شک نہیں کہ ضرور تاخیر ہوئی لیکن قصداً نہیں ہوئی۔ کانگریس اور لیگ کی مفاہمت میں جانا ضروری تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ اس موقع پر آپ سے بھی بہ سہولت ملاقات ہو جائے گی لیکن کلکتہ میں پریس کے انتظامات نے مہلت نہ دی پھر بعض اعزہ کی علالتوں سے پریشانی رہی۔ اس کے بعد رمضان آ گیا۔ سفر میں روزہ رکھ نہیں سکتا اور ترک طبیعت پر شاق گذرتا ہے۔ اس لئے سفر پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ اور اسی لئے آپ کو بلانے کا بھی موقع نہیں نکلا۔

بالفرض قصداً تاخیر ہوئی پھر بھی وہ نتائج کہاں سے اخذ کئے گئے جن کے بیان میں آپ نے اسقدر بیباکانہ سرگرمیوں کا اسراف کیا ہے؟ داد و دہش کی نمائش، کاسۂ گدائی، آپ کی امداد و عنایت کی حقیقت، رائیگاں بخشی، دست سوال اور کیا کیا ترکیبیں ہیں جو اس عجیب و ضخیم خطاب میں صرف کی گئی ہیں۔ بھلا کاسۂ گدائی اور دست سوال کا اس سے کیا علاقہ، اور جذبۂ داد و دہش کی نمائش کا یہاں کیا سوال؟ اگر میرے داد و دہش کی نمائش کی ہوتی۔ تو آپ کو حق تھا کہ اس نمائش پر ملامت کرتے اور اس کی حقیقت معلوم کر لیتے پھر سجدۂ شکر بجا لاتے لیکن میں حیران ہوں کہ موجودہ صورت حال کو ان باتوں سے کیا تعلق! کس نے نمائش کی؟ کس نے امداد کا اظہار کیا؟ یا تو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا کوئی خاص حالت آپ پر طاری ہو گئی ہے۔ مجھے آپ سے یکایک اس طرز کلام کی امید نہ تھی۔ میں آپ کا خط واپس بھیجتا ہوں۔ ممکن ہے اب آپ غور کر سکیں کہ کن خیالات و تاثرات کے ماتحت یہ اسلوب بیان پیدا ہوا؟

باقی رہا "زمیندار" سے علیحدگی اور اخبار کے اجراء کا معاملہ تو اس میں شک نہیں میرے خیال میں وہی صورت زیادہ مناسب تھی جو میں نے آپ کو لکھی تھی۔ اس میں ضرورت اور معیشت سے زیادہ مقصد کا عنصر کام کرتا تھا۔ لیکن اب کہ آپ نے علیحدہ ہو کر دوسرے اخبار کا کام شروع کر دیا ہے۔ شاید یہ مشورہ بعد از وقت ہو۔ نئے حالات ادھر کیا پیش آئے، مجھے معلوم نہیں۔ البتہ یہ حقیقت واضح تھی کہ "زمیندار" کا تعلق چل نہیں سکتا تھا۔ یہ بہتر تھا کہ کسی بہتر اقرب الی المقصد طریق عمل کے حصول کے بعد یہ قدم اٹھایا جاتا مگر اب جبکہ اٹھ چکا ہے تو بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ خدا آپ کو کامیاب فرمائے۔

البتہ اجرائے کار کے بعد بھی اگر ممکن ہو تو اس مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کیجئے۔

آپ یقین کیجئے میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں۔ اور اس لئے آپ کی جانب سے یکایک ایک نئی قسم کی غیر متوقع اسپرٹ کا اظہار میرے لئے تکلیف دہ ہوا۔ ممکن ہو تو مجھے اس کا سبب بتلائیے۔ کم از کم یہ تو معلوم کر لوں کہ میری کن باتوں سے آپ پر یہ اثرات طاری ہوئے؟ آپ نے یہ بھی نہیں لکھا کہ نئے اخبار کا انتظام کیوں کر ہوا ہے اور کہاں تک ہوا ہے؟ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو اس کی تفصیلات بھی لکھئے۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ علیحدگی کے بعد اب "زمیندار" سے کسی طرح کے رقیبانہ طرز عمل کا رکھنا ہر اعتبار سے غلط اور مضر ہوگا۔ اخبار تجارت بھی ہے اور قومی خدمت بھی ہے۔ تجارت کا حال معلوم ہے کہ ایک ہی بازار میں کپڑے کی بیس دوکانیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں۔ اور ہر صاحب دوکان اپنا رزق حاصل کر لیتا ہے۔ قومی خدمات کے اعتبار سے تو تعدد و کثرت محمود و مطلوب ہے نہ کہ موجب تحاسد و نزاع۔ پھر کیوں نزاع و مخالفت ہو۔

مولوی ظفر علی خاں صاحب نے "زمیندار" میں جو کچھ لکھا ہے وہ میری نظر سے گذرا ہے۔ اگر وہ اس طرز عمل پر قائم رہے تو یقیناً تعریف و تحسین کے مستحق ثابت ہوں گے۔

آپ نے پیغام کے متعلق لکھا ہے، کہ اس میں میرے مضامین نہیں نکلتے، اس لئے اس پر لوگوں کی توجہ نہ ہوئی۔ یہ بات نہیں ہے۔ مضامین کی اشاعت بغیر اس کے بے محل ہے کہ وہ ابتدائی مراحل سے گذر جائے اور کافی حلقہ اشاعت پیدا ہو جائے اب بتدریج شائع ہوں گے۔ اسے قلت اشاعت کی شکایت نہیں ہے۔ اشخاص کی قلت موجب تعجب ہے۔

ابوالکلام

---

۲۱ ۔ ۶ ۔ ۳۶

عزیزی۔ ایک خط کل بھیج چکا ہوں، یہ عجیب بات ہے کہ غالب کی غزل

مکاتیبِ آزاد

بنام غلام رسول مہر
۱۷ جون ۱۹۴۴ء

حبی فی اللہ، السلام علیکم،

میرے مضمون کا "زمیندار" میں جو حشر ہوا، وہ ناقابلِ برداشت ہے۔ اول تو کتابت اور چھپائی کا یہ حال ہے کہ نصف عبارت ناقابلِ قرأت، پھر جا بجا مضمون کے حصص میں اضافہ، کتابت کے اغلاط، کاتب صاحب یا مصحح کی اصلاحات

(۱) ابتدائی دو ٹکڑوں کا خاتمہ اس پر ہوا تھا "آئندہ حسب ذیل امور پر نظر ڈالی جائے گی۔ پھر ان مواد کی تفصیل تھی۔ "زمیندار" میں صرف حسب ذیل تک چھپ گیا۔ اس کے بعد پھر مواد کا حصہ نہ تو اس نمبر کے کسی دوسرے حصہ میں آیا اور نہ اس کے بعد چھپا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کے حصے کے ساتھ پہلے حصے کا کوئی ربط باقی نہ رہا۔ یہ کیسا افسوسناک تساہل ہے

(۲) اس کے بعد نیا سلسلہ شروع ہوا تو عبارت ابتدا ہی میں خبط کر دی گئی۔ سب سے مقدم بات یہ ہے کہ "موجودہ ترکی حکومت الخ" کی جگہ "بات یہ ہے کہ الخ" سے مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے عبارت اس قدر مسخ ہو گئی ہے کہ اس کے تصور سے اذیت ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ زمیندار میں متعدد حضرات اہلِ قلم موجود ہیں، پھر مضمون کی یوں مٹی پلید کی جاتی ہے

(۳) جا بجا کاتب صاحب کی اصلاحات نے عبارت کی رہی سہی نوعیت بھی ختم کر دی۔ "اسلام کی مطابقِ احوال و ظروف خصوصیات" ان کی سمجھ میں نہ آیا تو "اسلام کی مطابقِ احوال و ظروف کی خصوصیات" بنا دیا "کی" صاف بعد کو لکھی ہوئی یا پیچھے پر سائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

(۴) جس طرح پچھلے دو نمبر نا تمام چھپے اسی طرح اس نمبر میں بھی، خلافت کی بحث کے بعد عصمت پاشا کی تقریر کا ذکر تھا، یہ پورا حصہ حذف کر دیا۔

حیران ہوں کہ مضمون کہاں بھیجوں۔ یہ کیسی مصیبت ہے کہ ہندوستان بھر میں ایک اخبار بھی ایسا نہیں جہاں چار سطر بھی قرینے سے نکل جائیں۔ تو وجوہ میں ہمیشہ "زمیندار" کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ خلافت کمیٹی کو باوجود شدید اصرار کے بقیہ حصہ نہیں بھیجا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہاں نہ تو بجز انداز کے ایک صفحہ کی گنجائش ہے اور نہ کوئی نگران کار۔ سوچ رہا ہوں کہ اب ہمدم کو بھیجوں۔ شاید وہاں کچھ اہتمام ہو

ابوالکلام

۲۷ء

عزیزی، السلام علیکم،

خط پہنچا، رمضان نے مہلت نہ دی کہ بہ اطمینان جواب دیتا۔ آج عید ہے یہ پہلا خط آپ کے جواب میں لکھ رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ آپ نے اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم الخ کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ آپ کے خط کی مجموعی اسپرٹ میرے لئے تعجب و افسوس دونوں کا باعث ہوئی۔

آپ نے پہلے بطور خود یہ مقدمہ فرض کر لیا ہے کہ میں نے آپ کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر بہت سے عقاید و اصول اس پر متفرع کرتے چلے گئے ہیں۔ سب سے پہلے یہ بات صاف ہونی چاہیئے کہ خط کے جواب نہ دینے سے مقصود کیا ہے۔ اگر خط سے مقصود وہ خط ہے جو میرے خط کے جواب میں آپ نے غالباً جنوری میں بھیجا تھا، تو یہ

ہیں اور اس پر کافی کمیشن لے لیتے ہیں۔ اس قیمت سے زیادہ قیمت لینے کا انہیں حق نہیں۔

کیا آپ اس کا کوئی علاج بتا سکتے ہیں؟ مجھے نہایت اذیت ہوتی ہے۔ جب میں خیال کرتا ہوں کہ لوگ اپنے شوقِ مطالعہ میں ۶؍ کی جگہ للعہ دینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اور ایک شخص میری کتابوں کے نام پر لوگوں سے بے انصافی کر رہا ہے۔ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ "انقلاب" میں میری طرف سے اشتہار درج کرا دیں کہ "تذکرہ" کی قیمت ۶؍ روپیہ ہے۔ اس سے زیادہ قیمت لینے کا کسی تاجر کو حق نہیں۔ کیونکہ وہ کمیشن وصول کر رہا ہے۔ اگر اس قیمت پر "تذکرہ" لاہور اور پنجاب میں نہ ملے تو براہِ راست دفتر سے منگوا لیا جائے۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

کلکتہ

۳؍ دسمبر ۱۹۳۶ء

عزیزی

خط پہنچا۔ یہ تقی والی حکایت مندرجہ "یادگارِ غالب" عام حالات میں تو ضرور مستند معلوم ہوتی ہے لیکن خاص خاص حالات ہیں جو مستند نہیں۔[1] غالب نے خود لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی جب ملا عبدالصمد میرے مکان پر آ کر مقیم ہوا اور فارسی زبان کے اصول و قواعد میرے دماغ میں پیوست کر دیئے۔ عبدالصمد دو سال تک ٹھہرا تھا۔ اگر تیرہ برس کی عمر میں آیا ہو گا تو گویا زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقع ملا ہو گا۔ اگر غالب کی قدرتی استعداد و مناسبت کا یہ حال تھا کہ چودہ سال کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و غوامض کا متحمل ہو سکتا تھا جن سے سراج الدین علی خان آرزو، شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار جیسے دماغ سوختگانِ مدارس عمر بھر کے درس و تدریس کے بعد بھی آشنا ہو سکے تو یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا ہو، اور ندرت و غرابت کی وجہ سے اس بات کا چرچہ لوگوں میں ہونے لگا ہو؟ حتیٰ کہ میر صاحب تک یہ تذکرہ کسی نے پہنچا دیا ہو؟

اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا لیکن محض رفعِ حیرت کیلئے لکھتا ہوں کہ خود میں نے اسی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی میری شعر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا ہے۔ غالباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ بمبئی کے حکیم عبدالصمد فرخ نے جو "پیچ بہادر" نکالا کرتے تھے ایک گلدستہ "ارمغانِ فرخ" کے نام سے نکالا اور کلکتہ میں بعض شعرا اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے ایک مرتبہ اس کی طرح تھی

پوچھی زمین کی تو کہی آسماں کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی۔ تین شعر ان مرفوعات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کئے ہیں

نشتر بدل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زباں کی
گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزادئ خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسماں کی

---

[1] سوال یہ تھا کہ آیا یہ درست ہے کہ مرزا غالب کے اشعار آگرہ سے میر تقی کے پاس پہنچے اور میر نے کہا کہ اسے استاد کامل مل گیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ حالانکہ میر کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی مولانا نے اپنے ابتدائی حالات اسی سلسلہ میں بیان فرمائے ہیں۔ اور نہایت قیمتی مواد بہم پہنچائے۔ جو کسی دوسرے ذریعہ سے نہ مل سکتے تھے۔

آپ نے "مستی الفر" کہا ہے کہ نہیں
یہ بھی اسے حضرت ایوب نکالا ہے کہ نہیں

"الہلال" کی جلدوں میں نہیں ملی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کے نسخے سے میں نے یہ غزل بھی نقل کی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے "الہلال" میں اندراج کی نوبت ہی نہ آئی۔ مزید تصدیق اس خیال کی اس سے ہوتی ہے کہ نواب رامپور کے غسل صحت والا قصیدہ

مرحبا سال فرخی آئین
عید شوال ماہ فروردیں

"البلاغ" میں نکلا ہے "الہلال" کی آخری جلدیں نہیں۔ بہت ممکن ہے یہ غزل آئندہ اندراج کے لئے چھوڑ دی گئی ہو اور پھر اشاعت کا سلسلہ بند ہوگیا۔

چونکہ قدیم کاغذات ضائع ہو چکے ہیں اس لئے مسودات کے ملنے کی بھی کوئی توقع نہیں۔

نواب احمد سعید خاں والا نسخہ ان کے عزیزوں کے پاس ضرور موجود ہوگا۔ وہ نسخہ بجائے خود آپ کے لئے ایک اہم ماخذ کا کام دے سکتا ہے کیونکہ اردو کا قدیم مطبوعہ نسخہ ہے۔ اور سادہ اوراق پر کئی نظمیں خود غالب کے قلم سے لکھی ہیں آپ حاجی عبد الغفار صاحب (گلی جان والے) کوئی سڑک دہلی کے پتہ پر لکھئے بہت ممکن ہے وہ سراغ لگالیں

اتنے عرصہ کے بعد آج اس شعر اور قصیدے پر بھی نظر پڑی جو "الہلال" میں نکلا تھا اب غور کرتا ہوں تو آپ کا خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر میں

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا ازدحام

"ریل کھلنے" سے مقصود یہ نہیں ہے، کہ لفٹنٹ گورنر کی روانگی کا وقت قریب آگیا تھا یا خود غالب کی روانگی۔ بلکہ صریح یہ ہے کہ ریل کے افتتاح کا یعنی جب دربار میں لفٹنٹ گورنر کی تقریر یا سرکاری اعلان کی قرأت ہو چکی تو وہ ریل کے افتتاح پر متوجہ ہوئے اور اس موقع پر خاص خاص حکام و امرا کو آنے کا موقع دیا گیا اس مطلب کا قطعی قرینہ یہ ہے کہ اسوقت تک ریل وہاں جاری ہی نہیں ہوئی تھی کہ ریل کھلنے سے مقصود ریل پر سفر ہو ۱۸۵۷ء تک ریل کا اجراء صرف ہوڑہ سے رانی گنج تک ہوا تھا آرہ تک پٹری کچھ بچھ چکی تھی اور کانپور تک سڑک کی درستگی کا کام ہو رہا تھا غدر نے اس کی اہمیت سجھائی تو خصوصیت کے ساتھ کام بڑھایا گیا۔ اور ۱۸۶۱ء کے آخر میں جاری آباد تک اجراء کا سامان ہوگیا۔ یقیناً ۱۳ جنوری ۱۸۶۵ء کو ریل کے افتتاح کا جلسہ ہوا جمنا کے کنارے شامیانے لگے ہیں اور لفٹنٹ گورنر پنجاب نے اس کا افتتاح کیا ہے اسی کی طرف قصیدہ اشارہ کر رہا ہے

تعجب ہے یہ بات کیوں اسوقت سامنے نہیں آئی یقیناً لارڈ کیننگ والا دربار یہ نہیں ہوسکتا

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

علاج کے متعلق آپ کی اس درجہ آمادگی اور سرگرمی موجب تشکر و امتنان ہے۔ حکیم صاحب کا بھی شکر گذار ہوں۔ آئندہ اس بارے میں بھی لکھوں گا

ابوالکلام

---

۲۶ / جنوری ۱۹۳۹ء

عزیزی

۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہماری مسلمانوں میں راست بازی مفقود ہو گئی ہے خصوصاً ان مسلمانوں میں جو مذہب کا نام زیادہ بیچتے رہتے ہیں اسوقت میرے "انقلاب" میں انجمن ... لاہور کا ایک اشتہار دیکھا کہ "تذکرہ" کی قیمت للعہ ہے حالانکہ اس کی قیمت دو روپیہ ہے۔ اس قیمت کے حساب سے یہ لوگ "تذکرہ" منگوا لے

لہ یہاں غلطی سے نواب سعید الدین احمد خاں کو نواب احمد سعید خاں لکھ گئے

اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ بہ تفصیل لکھیں۔
میری طرف سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی۔ تاخیر کے لئے سخت نادم ہوں

فقیر ابوالکلام

خواجہ حسن نظامی کے نام
بنگلہ حافظ علیم صاحب
کانپور، ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۹ء

بھائی نظامی،

عرصہ کے بعد تم ملے اور پچھلی پُر از خلوص اور بے تکلفانہ صحبتیں یاد آگئیں۔ مگر جھوٹ کا عادی نہیں۔ سچ یہ ہے کہ باوجود میرے مکرر سہ کرر اصرار کے تمہارا ایک دن بھی نہ ٹھہرنا مجھے سخت گراں گذرا۔ یہ انکار اس لئے تو نہیں تھا کہ ایک عقیدت کیش کی معیت تھی اور میری بے تکلفیاں خوف دلاتی تھیں کہ کہیں کوئی مضر اثر نہ پڑے؟ اگر ایسا خیال ہو تو کچھ بے جا بھی نہیں۔ کلکتہ اور بمبئی میں خود مجھ کو اپنے احباب نے تکلف سے کبھی کبھی ایسا خوف ہو جاتا ہے مگر چند گھنٹوں کی صحبت میں تم نے اس کا تو اندازہ کر لیا ہوگا کہ ارادت اندیشوں کی موجودگی میں میرا سلوک کیسا ہوتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے کسی قدر متضاد و مختلف ہوں۔ خود میں گلیم زہد اور قبائے رندی کو ایک ہی وقت میں پہننے اوڑھنے کا مجرم ہوں۔ پس اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے ایک دوست سے جو سلوک میخانہ کی چھت پر کریں اسی کا مستحق اسے سجادۂ خانقاہ پر بھی سمجھیں؟

اس کی طرف سے تو مطمئن رہو، اور تم مجھے ایسا سچا خیر خواہ اغراض طلب اور دوست سمجھو جیسا کہ برسوں سے باہم سمجھا کئے ہیں مگر خدا کے لئے یہ بتلاؤ کہ اس اعراض و اغماض کا کیا مطلب تھا؟

آجکل جو کام تم نے شروع کیا ہے۔ گو میرا راستہ اس سے الگ ہے۔ مگر میں تو ہر راہ میں تیز گام ہوں اگر ضرورت سمجھو تو یہاں مجھ سے کافی اعانت مل سکتی ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

غلام رسول مہر کے نام
کلکتہ۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء

عزیزی،

میں کبھی آپ کو اخبار کے مسائل و روش کی نسبت کچھ نہیں لکھتا اسلئے کہ میں سمجھتا ہوں ہر شخص اپنے اخبار کی روش بہت سی مقامی اور ماحولی مصلحتوں کی بنا پر تجویز کرتا ہے اور جب تک وہ خود خواہش مند نہ ہو کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں دینا چاہئے مگر بعض اوقات آپ ویحانہ مخالفت کے جوش میں اسے دور چلے جاتے ہیں کہ منطق و استدلال کی کوئی حد بندی باقی نہیں رہتی۔ اور اس محبت کی وجہ سے جو آپ سے ہے، خیال ہوتا ہے کہ آپ کو ایسا تو نہیں کرنا چاہئے۔

اسوقت ڈاک آئی تو سب سے اوپر "انقلاب" تھا میں نے کھولا تو ایک نوٹ پر نظر پڑی "سرحدی کانگریسیوں کے ارادے" ـــــ اس میں آپ لکھتے ہیں کسی نے ڈاکٹر خان سے پوچھا "ہندی گورنمٹی سرکلر کیلئے کیا کرو گے؟" انہوں نے کہا "فوراً منسوخ کر دیں گے" ـــــ اسی سے اندازہ کر لینا چاہئے، کہ سرحدی کانگریسیوں کی اسلام دشمنیوں کا کیا حال ہے؟

کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ اس معاملہ کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت تصور کرتے ہیں جو فی الحقیقت مسلمانان ہند کے مقاصد کیلئے زیادہ سے زیادہ مہلک معاملہ ہے، اور جس سے بڑھ کر شاید ہی سنہ پرواری کی کوئی بات موجودہ سیاسی دور میں ہوئی ہو آپ لوگ اس بات پر تو بہت خوش ہو گئے کہ اس عقل فروش نے وحدت زبان و رسم الخط کا راگ گا کر مٹھی بھر سکھوں کے گرل اسکولوں کی سرکاری اعانت بند کر دی چاہی ہے۔ مگر اتنی واضح بات سامنے آئی کہ اگر ٹھیک انہیں دلائل کی بنا پر

شاہراہ

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں لیکن اسوقت انہیں لغویات نے لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی چھتیس برس گذر چکے ہیں۔ اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اسوقت محسوس ہوئی تھی جب "ارمغان فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالہ میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد مادر شاہ خاں شوخی رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے جس کی دوکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے میں بیمار ہوں وہ غزل کے لئے متقاضی ہے چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی "یاد نہ ہو، شاد نہ ہو" ـــــ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دئے کہنے لگے "اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے" میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے ـــــ "صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی" ـــــ اسوقت سوچتا ہوں تو یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو

پھر اسی زمانے میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ "محرن" نیا نیا نکلا تھا۔ اس میں چند تحریریں بھیجیں۔ لکھنؤ سے نوبت رائے نظر "خدنگ نظر" نکالا کرتے تھے اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کر دیں اور اس کی ترتیب اپنے ذمے لے لی۔ اسی زمانہ میں مولوی احمد حسن مرحوم فتحپوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور "تحفہ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین لکھنے لگا۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں۔ ایک رسالہ خود نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ یہ تمام معاملات سنہ ۱۹۰۳ء و سنہ ۱۹۰۴ء کے ہیں۔ اسوقت میری عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا تاکہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں، وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں۔ اس لئے والد مرحوم نے چند طلبا کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا تھا۔ ان میں قندھار کے ایک خاں صاحب تھے۔ جن کی داڑھی میرے قد سے بھی زیادہ دراز تھی

اسی زمانے میں تقریر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر میں نے سنہ ۱۹۰۳ء میں کی اسوقت عمر پندرہ تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی۔ اسوقت سولہ برس کی عمر تھی

بہرحال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا کوئی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں ہے اگر اس عمر میں میں تک بندی کرنے لگا تھا تو غالب جیسی شخصیت کے لئے جسے قدرت نے شاعری ہی کے لئے پیدا کیا تھا۔ یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے

ابوالکلام

نیاز فتحپوری کے نام
۲۲ جون سنہ ۱۹۱۴ء

صدیقی الاعز،

سخت نادم ہوں کہ اتنے عرصہ کے بعد جواب لکھتا ہوں آپ کا خط پڑھ کر معمولاً رکھ دیا تھا کہ ضروری خطوں کے ساتھ جواب لکھوں گا۔ ہفتہ میں ایک رات یہی کام ہوتا ہے لیکن غلطی سے وہ وہیں رہ گیا اور میں سمجھا کہ جواب لکھ چکا ہوں آج کاغذات دیکھے تو بکسہ موجود تھا۔ سخت شرمندگی ہوئی خواستگار معافی ہوں۔

نظم اشاعت درج "الہلال" ہوگی۔

ایک دوسرے امر کے لئے آپ نے لکھا ہے۔ مجھے ہمہ وقت ہر حال میں مستعد خدمت یقین کیجئے اگر کوئی سعی مفید مقصد نکلے تو اسے بہترین عبادت سمجھوں لیکن

غزل

تبرکات

مولانا اپنے اوائل شباب میں شعروشاعری کی طرف بھی راغب رہے ہیں یہ غزل ان کے اسی دور کی یادگار ہے۔ اور بطور تبرک کے پیش کی جارہی ہے، کوئی شبہ نہیں کہ مولانا اگر آگے بھی شعر گوئی کی طرف متوجہ رہتے تو بحیثیت شاعر کے بھی اپنے لئے ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کر لیتے ——— (ادارہ)

کیوں اسیر گیسوئے خمدار قاتل ہوگیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہو گیا

کوئی نالاں کوئی گریاں کوئی بسمل ہو گیا
اس کے اٹھتے ہی دگر گوں رنگ محفل ہو گیا

انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں
نور آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہو گیا

اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدائے دست قاتل ہو گیا

قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں
ہر بگولا دشت کا لیلیٰ کا محمل ہو گیا

یہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمند زلف کا
لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہو گیا

مولانا ابوالکلام آزاد

کا کو بہار، یو پی، مدراس، آسام اور بمبئی میں ہندو اکثریت نے ناگری رسم الخط کو سرکاری قرار دے دیا اور اردو رسم الخط والے اسکولوں کو سرکاری اعانت سے محروم کر دیا تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟

اتنا ہی نہیں بلکہ اس فتنہ نے اقلیتوں کے حقوق کی ساری عمارت ہی درہم برہم کر دی، یہ اصل ہی باقی نہ رہی کہ ان امور کے فیصلہ کا حق خود اقلیت کو ہے، نہ کہ اکثریت کو۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان دونوں اردو کے مخالف ہیں اور چاہتے ہیں صوبے کی زبان ایک ہی ہو، اور وہ بنگلہ ہو۔ اب پریسیڈنسی ڈویژن کی وہ لسانی اقلیت جس کی زبان اردو ہے، کیا کرے گی؟ کل کو اگر اس نے سردار جی کی مثال سامنے رکھ کر بنگال نے سرکلر جاری کر دیا کہ صرف انہیں اسکولوں کو مدد دی جائے گی جو بنگلہ زبان میں تعلیم دیں تو اس وقت کلکتہ کے ہزاروں ہندو مسلمان کیا کریں گے، جو اپنے بچوں کو بنگلہ میں تعلیم نہیں دینا چاہتے۔

ایک لمحے کیلئے اس غلط فہمی میں نہ پڑیئے کہ ہمارے نزدیک حقیقت و انصاف کیا ہے اور اس کے دلائل وضاحت کیا ہونا چاہئے۔ ان امور میں سوال دلائل و منطق کا نہیں ہوتا، اگر دلائل سے جماعتی کشاکش کا فیصلہ ہو سکتا، تو دنیا کے سارے جھگڑے معدوم ہو جاتے۔ سوال صرف یہ ہے کہ ایک صوبہ کی ایک اقلیت صحیح بنیادوں پر یا غلط بنیادوں پر، مگر اپنے بچوں کو کس رسم الخط کی تعلیم دینا چاہتی ہے؟ اس کو اس کا حق ہے یا نہیں؟ اور صوبہ کی گورنمنٹ کو اس کا اعتراف کرنا چاہیئے یا نہیں؟

تیس برس سے مسلمان پیٹ رہے تھے کہ اس کا حق اقلیت کو ہے نہ کہ اکثریت کو اور اصل اس بارے میں یہ ہونی چاہیئے کہ کوئی اکثریت صرف اپنا فیصلہ دوسرے پر نافذ نہ کرے۔ متعصب ہندوؤں کو اس کے قبول کرنے میں تامل تھا لیکن بات اتنی صاف تھی کہ اعلانیہ رد نہیں کر سکتے تھے وہ چاہتے تھے کہ اس اصل کی کاٹ کیلئے کوئی ہتھیار مل جائے۔ لیکن ہتھیار ملتا نہیں تھا۔ اب صوبہ سرحد نے یہ سرکلر جاری کر کے انہیں ان کا ہتھیار دے دیا۔ انہوں نے بہت شور مچا دیا کہ حجت قائم ہو جائے، پھر خاموش ہو گئے۔ اب بہار وغیرہ میں گورنمنٹیں سے دیکھئے۔ دیکھ لیجئے گا کہ اس سرکلر کی حمایت میں شور مچا کر آپ لوگوں نے اردو کی کسی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔

سرحد کے اس سرکلر کا معاملہ جب پہلے پہل اخبار میں آیا تو میں نے خیال کیا اس میں کوئی غلط فہمی کام کر رہی ہے، کیونکہ خود مسلمانوں کے فرقہ وارانہ نقطہ خیال سے یہ بات اس درجہ غلط اور مہلک تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا ڈاکٹر خان صاحب اور عبدالقیوم اور ان کے مشیروں سے ایسا کیا ہو گا؟ لیکن جب میں نے ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا واقعی یہی بات ہے۔ اس پر میں نے سرعدالت سے ایک شخص کا خط لکھ کر بھیج دیا اور پوری تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا کہ یہ کارروائی کس درجہ مضر ہو گی۔ چونکہ ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اسلئے وہ خاموش ہو گئے۔ اب معلوم ہوا ہے سرحد سے اردو ہی کو اڑا دینا چاہتے ہیں اور پشتو کے مصائب و فضائل ور د زبان ہیں۔

بہار میں سالہا سال سے کوشش کی جا رہی ہے کہ ناگری رسم الخط کے سوا اور کسی خط کا اعتراف نہ کیا جائے۔ دوبارہ اقدام ہو چکا ہے اور محض کانگریس کی مداخلت سے رکا ہے۔ اب صوبہ سرحد کی اس حماقت نے ان کے لئے دروازہ کھول دیا۔ جب دوبارہ ایسا ہو گا تو دیکھ لیجئے گا، وہی زبان، وہی دلیل، وہی منطق کام میں لائی جائے گی جس پر تمام مسلمانوں کی تائید و توثیق کی مہر لگ چکی ہے۔

اگر فی الحقیقت ڈاکٹر خان یا وہاں کی کوئی جماعت ایسا کر سکی ہے کہ اس فتنہ انگیز سرکلر کو منسوخ کر دے تو میں سمجھتا ہوں یہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں ہو گی بلکہ ایک نہایت ضروری خدمت ہو گی جو سرحد کی کوئی جماعت انجام دے سکتی ہے۔

یقیناً آپ لوگوں نے اس کی حمایت اپنی سمجھ کر کی ہے کہ اردو اور مسلمانوں کے مقاصد کی حمایت کر رہے ہیں لیکن کیا معاملہ کا یہ پہلو قابل غور نہیں ہے کہ حمایت کا ولولہ کس طرح ہم سے تخریب و مخالفت کا کام کرا رہا ہے؟ اگر مسلمانوں کی رائے عامہ اس سانچے میں ڈھالی جائے گی، تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ کس طرح لوگ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا مستقبل خطرہ میں ڈالتے رہیں گے؟ افسوس کہ ڈال رہے ہیں، ہر گوشے اور ہر میدان میں!

امید ہے خلاف معمول میری یہ دراز نویسی آپ پر شاق نہیں گذرے گی۔ اگر آپ کی محبت متقاضی نہ ہوتی تو کبھی یہ قصہ نہ چھیڑتا۔ مقصود یہ نہیں ہے کہ کسی خاص مسلک یا گروہ کی حمایت کی جائے یا مخالفت کی جائے، صرف اس حقیقت پر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہر مسئلہ کو خود اس مسئلہ میں دیکھنا چاہیئے یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ حریفی مخالفت کی رو میں بہے جائیں اور جو چیز سامنے آئے اسے بہاتے ہوئے لے جائیں۔

گوسپند خاک ما ہم مزار رفتہ باشد

ابوالکلام

تم ہو زباں دراز تو ہم بے زبان ہیں
تم ہم سے کم نہیں ہو تو ہم تم سے کم نہیں

(۳)

ایک ہے مسرور اک ناشاد ہے
بزمِ ہستی کی عجب روداد ہے
قید میں جلتا نہیں بُلبُل کا دل
یہ چراغ خانۂ صیاد ہے
ایک عالم کی اُڑائی اس نے نیند
اب مری فریاد کی فریاد ہے
بن پڑے تو ہم بھی دیں حوروں کو دل
دشمن جاں حسن آدم زاد ہے
ہجر کی شب دیکھئے کیوں کر کٹے
ہر ستارہ دیدۂ جلّاد ہے
جس کو سب کہتے ہیں آہ نیم جاں
یہ وہی تو خانماں برباد ہے

(۴)

نہ توڑو، بتو، دل شکستوں کے دل
ڈرو گھر خدا کا گراتے ہوئے
خدا جانے کب دل میں آئے گئے
انہیں آتے دیکھا نہ جاتے ہوئے
مری قبر پر آکے کہتے ہیں وہ
بہت نیند کے آپ مارے ہوئے

مولانا ابونصر آہ

مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی کا نام ابونصر تھا اور شاعری میں آہ تخلص کرتے تھے۔ مولانا نے ان کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے ـــــ "اردو، فارسی، عربی کے علاوہ ترکی میں بھی بہت عمدہ قابلیت ہندوستان ہی میں پیدا کر لی تھی اور اردو تحریر میں ان کو بہت عمدہ سلیقہ ہو گیا تھا۔ وہ اگر زندہ رہتے تو یہ قطعی بات تھی کہ علم و قابلیت کے اعتبار سے بہت جلد ایک نمایاں مقام حاصل کر لیتے .... ترکی، عربی اور انگریزی سے ترجمہ کر کے انہوں نے متعدد نئے قسم کی عمدہ نظمیں لکھی تھیں۔ شاعری میں آہ تخلص کرتے تھے اردو کے علاوہ فارسی میں ان کا کافی مقدار میں کلام موجود ہے" ہم ذیل میں آہ مرحوم کا منتخب کلام دے رہے ہیں۔

(ادارہ)

(۱)

دل میں لازم ہے خیال روئے پر تنویر بھی
چاہیے اس آئنہ کو نور کی تصویر بھی

سوئے زندان جب ترا دیوانۂ گیسو چلا
پاؤں پڑنے کے لئے آگے بڑھی زنجیر بھی

روح سارے جسم کی آتی ہے کھنچ کر کان میں
سحر ہے ظالم تری جادو بھری تقریر بھی

آہ، اس سفاک نے ہم پر کبھی کھایا نہ رحم
روتے جاتے ہیں ہمارے حال پر رہ گیر بھی

(۲)

کہتا ہوں جب کہ مجھ پہ نگاہِ کرم نہیں
کہتے ہیں ناز سے وہ خدا کی قسم نہیں

تیرے جفا و جور کا ہم کو الم نہیں
جینے کا اپنے رنج ہے مرنے کا غم نہیں

تکتے ہیں گاہ مجھ کو کبھی وہ رقیب کو
شوخی سے شرم، شرم سے شوخی کبھی کم نہیں

دل کی تڑپ میں شوخیٔ جاناں کا ہے مزہ
اب آرزوئے وصل خدا کی قسم نہیں

مولانا ابوالکلام آزاد

نواب کلب علی خاں اور مرزا غالب

مرزا کی کوشش

رام پور سے مرزا غالب کے مکاتیب کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے (۳) پر نظر ڈال لینی چاہیئے۔ مرزا کی بیوی نے ان کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں کو کئی عرضیاں بھیجی تھے اور مدد چاہی تھی، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

البتہ حسین علی خاں رام پور گئے اور کمیس روپیہ کے ملازم ہو گئے۔ غالب نے اپنی زندگی میں بہت کوشش کی تھی کہ رام پور سے ان کیلئے وظیفہ مقرر ہو جائے، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا

غالب کا ایک قطعہ

دراصل کلب علی خاں کو غالب سے وہ عقیدت نہ تھی جو یوسف علی خاں کو تھی۔ وظیفہ جاری رکھا تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے علاوہ بریں کلب علی خاں سخت متعصب سنی تھے غالب کی شیعیت بھی انہیں کھٹکتی ہوگی غالب نے اسی خلش کو نکالنے کے لئے ایک قطعہ بھی لکھا تھا۔

ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدرآباد دکن رشک گلستان ارم
رام پور اہل نظر کی نظر میں ہے وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ
اس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم

جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوا تھا تو مشہور ہوا تھا، کہ اب کلب علی خاں کسی شیعہ کو ریاست میں ٹکنے نہیں دیں گے۔ یہ خبر غالب تک بھی پہنچی تھی اور بہت ہراساں ہوئے تھے، مگر جب مسند نشینی کی تقریب میں رامپور گئے تو وہاں سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔

"گھر میں کہہ دو کہ جو بات سنی گئی تھی، وہ غلط نکلی" یہ اسی طرف اشارہ ہے

کلب علی خاں کا سنت میں غلو مشہور ہے۔ ان کے بعد جب رام پور میں پھر شیعیت آئی، تو وہ بھی اپنے علیحدہ کافی مشہور ہوئی۔

نواب کا درجہ علم و ذوق

نواب کلب علی خاں نے وقت کے عام مذاق کے مطابق فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی، اور نظم و نثر لکھنے کا شوق رکھتے تھے ان کی کئی نثریں اور دو فارسی دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی دیوان سپہر کاشانی مصنف ناسخ التواریخ کو معائنہ کیلئے بھیجے تھے اور حسب قاعدہ اس سے مداحی کرائی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نثر میں کوئی رنگ ہے نہ نظم میں کوئی بات ہے نثر میں جلالائے طباطبائی کی تقلید کرنا چاہتے ہیں لیکن اول طباطبائی کا اسلوب ہی کون بلند اسلوب ہے پھر اس کی تقلید کیلئے بھی قدرت و سلیقہ چاہیئے۔ نظم میں جو کچھ کہا ہے محض نوابی کا شوق پورا کیا ہے ایک شعر بھی ایسا نہیں جس پر نظر رکے۔ فارسیت کے لحاظ سے بھی بہت پست درجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص مرزا غالب کے درجہ و مقام کا کیا شناسا ہو سکتا تھا۔ منشی امیر احمد مینائی کو چونکہ رسوخ حاصل ہو گیا تھا اسلئے انہوں نے اپنے استاد منشی مظفر علی اسیر کو آگے بڑھا دیا۔

برہان قاطع والی مصیبت

رامپور کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلب علی خاں ابتدا میں مرزا غالب سے ادبی علائق رکھنا چاہتے تھے۔ اور ایک نثر معائنہ کیلئے بھیجی تھی بظاہر شاگردانہ درخواست اصلاح تھی مگر دراصل ان سے مداحی کرانی چاہتے تھے انہوں نے بڑی تعریف کی، طاہر وحید اور طباطبائی سے بڑھا دیا۔ لیکن چونکہ اصلاح کے معاملہ میں دانستہ تسامح ممکن نہ تھا اسلئے بعض الفاظ کی تصحیح کر دی، کلب علی خاں پر یہ بات گراں گذری ان کے استاد نے ہندوستانی لغت نویسوں کی عبارتیں نکال کر پیش کر دیں اور وہ انہوں نے مرزا کو بھیج دیں۔ مرزا بے چارے اب رامپور کے وظیفے پر جی رہے تھے یہ معاملہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے "برہان قاطع" والی مصیبت یہاں بھی پیش آ گئی۔ پہلے ہندوستانی لغت نویسوں کے بات میں اعتقاد لکھا پھر جب اس پر کلب علی خاں بگڑ گئے، تو زاری کر کے معافیاں مانگیں۔

افسانہ

ابوالکلام آزاد

قمار باز

——علم و ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس میں مولانا نے گام فرسائی نہ کی ہو، اور کوئی میدان، عرصۂ حیات کا ایسا نہیں ہے جس میں مولانا پا بہ رکاب نہ رہے ہوں خود فرماتے ہیں —— "مذہب، علوم و فنون، ادب، انشا، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار راہیں مبدءِ فیاض نے مجھ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامنِ دل مالا مال نہ ہوا ہو" چنانچہ ایک دور مولانا پر افسانہ نویسی کا بھی گذرا ہے۔ اور اس راہ میں بھی وہ کامیاب و کامران رہے ہیں۔ "قمار باز" ان کی ایک نمائندہ اور یادگار کہانی ہے! —— (مدیر)

طامس ایک سنگدل قمار باز رات کو گھر سے نکلا جس طرح قطب نما کی سوئی ہمیشہ قطب کی طرف رہتی ہے۔ اسی طرح قمار باز کا دل بھی قمار خانہ سے ہٹ نہیں سکتا لیکن عین اسی وقت اس گھر میں ایک اور دل بھی تھا جس کی محبت کی سوئی بالکل اسی طرح طامس کے مہر دل کی طرف پھری رہتی تھی۔

اس کی بیوی نے اپنے شیر خوار بچے کی طرف دیکھا جس کو صبح سے دودھ کا ایک قطرہ نصیب نہیں ہوا تھا کیونکہ خود اس کی ماں پر فاقہ کی دو ستائیں گذر چکی تھیں۔ وہ بلک رہا تھا۔ لیکن اس نے جلد ہی اس کی طرف سے آنکھیں ہٹا لیں اور ان پُر آب آنکھوں میں جن میں حسرت و مایوسی کے آنسو بھرے ہوئے تھے، طامس کی طرف دیکھا۔

آہ! "عورت" کی نظر جبکہ اس میں مایوسی ہو آہ وہ فطرتِ عالم کی حکمرانِ جمیل، جس کی نگاہ قاہر امیدوں اور مایوسیوں کی بخشش گاہ ہے کون دیکھ سکتا ہے، کہ خود کسی نگاہ سے رحم و طلب کی طالب ہو۔

لیکن طامس نے اس کی نگاہ امید طلب اور اشک داد خواہ کی حقارت کی۔ اس نے بے پروائی سے اسے ٹھکرا دیا وہ سوچنے لگی کہ یہی نے مہر اشک محبت سے نا آشنا آنکھیں تھیں جنہوں نے اس سے پانچ سال پہلے ایک ایسی ہی رات میں اپنے اشک ہائے محبت خواہ سے میرا ہاتھ تر کر دیا تھا اس نے مجھ سے محبت مانگی تھی لیکن آج میں اس سے رحم کی طالب ہوں۔

وہ قمار خانہ کی طرف روانہ ہو گیا کاش وہ کسی طرح سمجھ سکتا کہ یاس و حسرت کی نگاہیں کس طرح اس کا تعاقب کر رہی ہیں؟ وہ عشقِ قمار سے بیخود تھا کاش اسے یاد آتا کہ ایک دل ہے جو اسی کی طرح قمارِ محبت میں بازی ہار چکا ہے، اور اب فتحیاب دشمن کے قبضہ میں ہے

صبح کو وہ اٹھی، بچے کو گود میں لیا، اور قمار خانہ میں آ کر اپنے گم گشتہ قمار کو تلاش کیا اس کا سر چکرا رہا تھا مگر اس کو سننا پڑا کہ رات کو پولیس کا ایک گروہ اس کے شوہر کو گرفتار کر کے لے گیا ہے اب اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ سفر حیات کی ایک ایسی منزل آنسوؤں کی بھی تھی۔ مگر وہ اس سے گذر چکی تھی۔

وہ راہ پوچھتی ہوئی قید خانہ کے دروازے پر آئی بچہ اس کی گود میں تھا۔ دروازہ کے روزنوں سے جھانک کر ڈھونڈنے لگی کہ طوق و زنجیر کی فضائے محن میں وہ کہاں ہے؟

کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت اس کے دل میں کیا کیا خیالات گذر رہے تھے؟ عورت کے دل کو، اس گنجِ مخفی اس طلسمِ جمیل اس عقدۂ حسین کے دل کو دنیا میں کون سمجھ سکتا ہے؟ ■

رکھیں گے۔ باغی فوج کے ساتھ دربدر پھرنے سے کیا فائدہ؟ بخت خاں نے ہرچند اصرار کیا اور بار بار منتیں کیں مگر سود مند نہ ہوا غدر کے تمام انگریز مورخ لکھتے ہیں کہ اگر بادشاہ بخت خاں کی فوج کے ساتھ نکل جاتے۔ اور اودھ اور روہیل کھنڈ میں بادشاہ کو فوج کے ساتھ دکھایا جا سکتا تو بہت ممکن تھا کہ واقعات کی رفتار بالکل دوسری ہو جاتی

رجب علی اور الٰہی بخش

اس سازش میں مرزا الٰہی بخش بھی شریک تھے۔ جیسے باسورتھ اسمتھ لارڈ لارنس کا سوانح نگار نہایت موزوں تلقب سے بار بار یاد کرتا ہے یعنی "دہلی کا غدار"۔ قلعے کے سقوط کے تیسرے دن مرزا الٰہی بخش نے مقبرہ ہمایوں میں بادشاہ کی موجودگی محقق کر لی۔ اور رجب علی کو اطلاع دے دی۔ رجب علی نے اپنے آقا ہاڈسن کو فوراً مطلع کر دیا ولسن متامل تھا لیکن ہاڈسن نے اپنی ذمہ داری پر جانا قبول کر لیا اور اپنے رسالہ کے سواروں کو مع الٰہی بخش اور رجب علی کے روانہ ہو گیا۔

ہاڈسن کا عہد

مقبرہ کے پاس پہنچکر ہاڈسن مع سواروں کے ایک پرانی عمارت میں چھپ گیا۔ الٰہی بخش اور رجب علی اندر گئے اور بادشاہ سے کہا "یہی وقت ہے، چلئے اور صفائی کر لیجئے۔ ورنہ پھر یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا"۔ تمام شاہزادے اور ہاڈسن بلند آواز سے پکارے کہ بادشاہ کی حفاظت جان کی ذمہ داری لی جاتی ہے تو میں بلا تامل سوار ہو جاؤں گا چنانچہ ان دونوں ایمان فروشوں نے آکر ہاڈسن سے صورت حال کہدی۔ ہاڈسن یہ سن کر مقبرہ کے اندر گیا اور عمارت کے قریب آکر باآواز بلند اعلان کیا "اگر بادشاہ دہلی نے بغیر مقابلہ کے اپنے آپ کو حوالہ کر دیا تو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے ان کی جان و عزت کی حفاظت کی ذمہ داری لی جاتی ہے"۔ تین مرتبہ یہ صدا لگا کر وہ واپس چلا گیا۔

بادشاہ کی حوالگی

تھوڑی دیر کے بعد بہادر شاہ پالکی میں سوار ہو کر برآمد ہوئے۔ انہوں نے کہا "کیا ہاڈسن صاحب بہادر یہیں ہیں؟"۔ ہاڈسن نے کہا "میں ہاڈسن ہوں"۔ سکھوں کی دوسری جنگ کے موقع پر یہ دہلی میں رہا تھا۔ اور قلعہ میں پیش ہو چکا تھا اسلئے بادشاہ اس سے واقف تھے۔ پھر ہاڈسن پالکی کے پاس آیا اور اسلحہ کا مطالبہ کیا۔ بہادر شاہ کے ساتھ پالکی میں دو تلواریں دونوں طرف رکھی تھیں۔ انہوں نے ہاڈسن کے حوالے کر دیں۔ ان میں سے ایک تلوار نادر شاہ کی تھی۔ جو اس نے محمد شاہ کو بھائی بناتے ہوئے، محمد شاہ کی تلوار سے بدلی تھی۔ اور اسوقت سے ہمیشہ شاہان مغلیہ کی خاص تلوار رہی۔ ہاڈسن لکھتا ہے۔

"جب میں نے بادشاہ کی گرفتاری کی خبر ولسن کو دی اور اسے معلوم ہوا کہ بغیر کسی مزاحمت کے اس آسانی کے ساتھ بادشاہ قبضہ میں آ گیا ہے تو بہت خوش ہوا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے کہا "یہ نادر شاہ کی تلوار اگر مجھے مل جائے تو نہایت شکر گزار ہوں گا ـــــ" ولسن نے اٹھا کر میرے حوالے کر دی۔

ہاڈسن کا ایک خط

ہاڈسن نے اپنے ایک خط میں جو دہلی سے اپنے بھائی کو بھیجا تھا۔ یہ تمام تفصیلات بیان کی ہیں ـــــ "لندن ٹائمز" میں بھی چھپ گیا تھا۔ ہاڈسن لکھتا ہے کہ جب میں بہادر شاہ کی پالکی لے کر دہلی دروازہ سے گذرنے لگا تو افسر متعینہ محل نے پوچھا "پالکی میں کون ہے؟" ـــ میں نے کہا ـــ "صرف (اونلی) بادشاہ دہلی" ـــ فوراً تمام کیمپ میں غلغلہ پڑ گیا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس آسانی سے غدر کا یہ عظیم الشان نشان انگریزی قبضے میں آ جائے گا۔

بادشاہ کی اسیری

بہادر شاہ کو پہلے قلعے میں لا کر اس کوٹھری میں رکھا جو قلعہ میں مطبخ کے نام سے مشہور تھی۔ اور جس میں غدر کے انگریز اسیروں کو رکھنا بیان کیا گیا تھا۔ یہاں گورے شب و روز سر پر مسلط رہتے تھے۔ اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے تھے۔ تذلیل و تحقیر کی کوئی حرکت ایسی نہ تھی جو نہ کی جاتی ہو۔ پھر چند دنوں کے بعد یہاں سے نکال کر چاندنی چوک کے ایک مکان میں رکھا گیا۔ یہیں رابرٹس نے بہادر شاہ کو دیکھا تھا۔ جیسا کہ اس نے اپنے چہل سالہ قیام ہند کی خودنوشتہ سوانح عمری (فورٹی ون ایرس ان انڈیا) میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے "میں نے محسوس کیا کہ میری اور میرے ساتھی کی موجودگی اس بدبخت کیلئے تکلیف دہ ہو رہی ہے اسلئے میں جلد وہاں سے چلا آیا۔"

زینت محل کے پیام

ہاڈسن کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فتح دہلی کے ساتھ ہی زینت محل کے پیام آنے شروع ہو گئے تھے۔ یہ پیام یقیناً الٰہی بخش کے ذریعہ آتے ہوں گے۔ غدر سے چند سال پہلے جب ڈلہوزی نے یہ تجویز کی تھی کہ بادشاہ قلعہ خالی کر دیں اور قطب میں جا کر رہیں اور بادشاہ نے انکار کر دیا تھا تو اسی الٰہی بخش نے زینت محل کو آمادہ کر کے درخواست بھجوائی تھی کہ اگر جوان بخت کو ولی عہد کر دیا جائے تو تخلیہ قلعہ اور قیام قطب کی تجویز میں منظور کرا لوں گی۔ گورنمنٹ نے اس پر کوئی

اختلافات

"ارتنگ" اور "ارژنگ" کو برہان قاطع وغیرہ نے مرادف لکھا ہے۔ لیکن قطعاً غلط ہے۔ ارتنگ مطلق مرقع کے معنی میں بولا گیا ہے جیسے "ارتنگ معانی" ــــ اور ارژنگ ایک مصور کا نام تھا۔ نظامی نے شیریں خسرو میں کہا ہے۔

نقص دو لنم مانی و ارژنگ
طراز سحر می بستند سنگ

نواب کلب علی خاں نے انہیں مرادف سمجھ کر جمع کر دیا تھا۔ غالب نے اس سے اختلاف کیا۔ اسی طرح آشیاں چیدن کو عرفی کے مکتی شارحوں نے آشیاں بستن کے معنوں میں لیا ہے۔ مگر غلط ہے۔ کلب علی خاں اس پر بھی مصر ہوئے اور ثبوت میں عرفی کی شرح پیش کی

زمانے کی ستم ظریفی

زمانے کی ستم ظریفی دیکھنی چاہیے کہ غالب جیسے مغرور فن و کمال کو ایک خام کار مسند نشینی کے آگے کس کس طرح جھکا کر چھوڑا ؟ اور کس لئے ؟ ــــ صرف اسلئے کہ جانتا تھا اگر سو روپیہ کی ماہوار بخشش بند ہو گئی تو جینے کا کوئی سہارا باقی نہ رہے گا۔

جب کلب علی خاں نے تواضعاً لکھا کہ نسبت تلمذ رکھتا ہوں۔ تو لکھتے ہیں

"یہ دوکان بے رونق کی خریداری ہے۔ میں تو حضور کو اپنا استاد اپنا مرشد، اپنا آقا جانتا ہوں اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ "ارتنگ و ارژنگ" متحد المعنی ہیں تو میں نے بے تکلف مان لیا۔ لغت نویسوں کے قیاس کے بموجب بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق۔"

پھر جب اس پر اظہار ناراضگی ہوا تو لکھتے ہیں

"خط پڑھتے ہی کانپ اٹھا۔ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ گناہ معاف کیجئے نوید عفو سے تقویت پہنچایئے۔"

جس شخص کی رگ گردن اسقدر سخت تھی کہ ہندوستان کے تمام فارسی ادیبوں میں سے خسرو کے سوا اور کسی کے آگے نہیں جھکی تھی۔ اور فیضی و ابوالفضل جیسے باکمالوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ کلب علی خاں کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر سر جھکا رہا ہے کہ میں نے خداوند نعمت کا حکم مان لیا اور اپنی تحقیق سے باز آیا

غالب کا ایک خط اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء

رامپور کے ایک مجموعے سے ایک عجیب بات کا انکشاف ہوتا ہے۔ غدر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہوا اس سے دو ماہ پہلے یعنی ۸ مارچ ۱۸۵۷ء کو غالب نے ایک خط لکھا ہے۔ جس میں درخواست کی ہے کہ اسے پڑھ کر چاک کر دیا جائے چنانچہ دفتر میں یہ تصریح ملتی ہے کہ "حسب الحکم چاک نمودہ شد" اور نواب صاحب جواب میں لکھتے ہیں ــــ "حسب الارقام صحیفہ موصوفہ را بعد استعاضہ مضمونش چاک نمودہ شد۔ آیندہ ہم در بارۂ ہمچو مکاتیب تعمیل ایمائے سامی ملحوظ خواہد شد ــ" (مجموعہ رامپور کا حاشیہ ص ۸)

سوال یہ ہے کہ یہ احتیاط کیوں برتی گئی۔ بظاہر حال مرزا غالب اور نواب صاحب کی خط و کتابت اصلاح شعر سے تعلق رکھتی تھی۔ کیوں مرزا کو خیال ہوا کہ ان کا خط چاک کر دیا جائے ؟ ــــ اور کیوں نواب صاحب نے بھی بلا تردد اس کی تعمیل کی

کیا غدر سے دو ماہ پہلے دہلی میں پولیٹیکل انقلاب اور فوجی بغاوت کے چرچے ہو رہے تھے ؟ کیا قلعے میں اس کے تذکرے شروع ہو چکے تھے اس سلسلہ میں جو معلومات میں فراہم کر رہا ہوں بہ سلسلہ تاریخ غدر ۱۸۵۷ء ان سے جواب اثبات میں ملتا ہے عجب نہیں مرزا غالب نے ان امور کی نسبت کچھ لکھا ہو اور اسلئے گہری احتیاط کا مقتضی ہو کہ یہ خطوط چاک کر دیئے جائیں۔

بہادر شاہ کی گرفتاری

حکیم احسن اللہ خاں

یہ صحیح نہیں کہ حکیم احسن اللہ خاں کے خلاف بدگمانی بے اصل تھی۔ عین محاصرۂ دہلی کے دوران میں یہ برابر انگریزی کیمپ سے نامہ و پیام کرتے رہے خود ہاڈسن اپنے خطوط میں لکھتا ہے جب مجھے دہلی جانے کا حکم ہوا تو میں نے سر ہنری لارنس کے منظور نظر (فیورٹ) یک چشم رجب علی کو بطور منشی اپنے ساتھ لے لیا اس نے دہلی کے سامنے پہنچتے ہی نامہ و پیام شروع کر دیا۔ چنانچہ قلعے کے حکیم کے خطوط آنے لگے۔

دو باتوں کا وعدہ

حکیم احسن اللہ خاں نے انگریزوں سے دو باتوں کا وعدہ کیا تھا بادشاہ کو دہلی سے فوج کے ساتھ جانے نہ دیں گے۔ قلعے کے دفتر کے کاغذات محفوظ رکھیں گے اور انگریزوں کے حوالے کر دیں گے چنانچہ انہوں نے یہ دونوں باتیں پوری کر دکھائیں۔ بادشاہ کو یقین دلایا کہ انگریز آپ کو پھر بدستور سابق قلعہ میں بٹھا دیں گے

درمعرض تلف افتد ”بہ باطن بیگانہ وبہ ظاہر آشنا ماندم“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام غدر میں انہوں نے ایسی روش اختیار کر رکھی تھی کہ بظاہر آشنا رہتے تھے۔ اگرچہ وہ کہتے ہیں کہ ”بباطن بیگانہ“ تھے اور یہی صورت حال صحیح معلوم ہوتی ہے۔

امید وبیم کے تین دور

غدر کے بعد دہلی پر امید وبیم کے تین دور گذرے ابتدا کے دو مہینوں میں ہر طرف سے انقلاب و خروج کی خبروں کا آنا۔ پیہم باغی فوجوں کا خزانے اور سروسامان کے ساتھ پہنچنا۔ انگریزی رعب وطاقت کا بہ کلی زوال اور دہلی کی حملہ آور فوج کے پے درپے مصائب اس کے لئے کافی تھے کہ دور اندیش سے دور اندیش دماغوں کا یقین بھی متزلزل ہو جاتا۔ اور وہ سمجھنے لگتے کہ اب انگریزی اقتدار کے سنبھلنے کی کوئی امید نہیں۔ لیکن پھر جب قلعے کی نااہلیاں آشکارا ہونے لگیں اور فوجی افسروں کی رقابتوں اور باہم دگر شکست کار کی سازشوں کا بازار گرم ہوا نیز انگریزی کیمپ نے اپنی طیاریوں اور متوقع فتح مندیوں کی اطلاعیں بھیجنی شروع کیں تو ابتدائی تصور متزلزل ہو گیا۔ اور سمجھ دار لوگ خیال کرنے لگے یہ ہنگامہ جمنے والا نہیں اس اثنا میں فوج ضروریات سے تنگ ہوئی شہر پر روپیہ کی وصولی کے لئے سختیاں ہونے لگیں۔ انگریزی متوسلوں پر حملے ہوئے۔ نیز جیسا کہ اس طرح کی انقلابی حالتوں کا لازمی خاصہ ہے۔ بدنظمی طوائف الملوکی اور ہنگامہ آرائیوں کا دور بھی شروع ہو گیا۔

شک وتذبذب کا یہ درمیانی دور اگست کے اوائل تک رہا۔ پھر جونہی انگریزی فوج نے کشمیری دروازے کی طرف بڑھنا شروع کیا شہر کے ہر متنفس کو ان کی آمد وفتح کا یقین ہو گیا۔

غالب کا معاملہ

سوال یہ ہے کہ کیا اس تمام عرصہ میں مرزا غالب اپنے تاتر ویقین میں دہلی کی تمام خلقت سے بالکل الگ رہے۔ دہلی میں سرکار انگریزی کے جتنے متوسل تھے۔ سب کا یقین اوائل میں متزلزل ہو گیا تھا۔ اور یہ دیکھ کر کہ شاید اب ورق الٹنے والا ہے۔ قلعہ کے ساتھ اظہار ارادت کرنے لگے تھے۔ البتہ دانش مندوں کی روش محتاط رہی تھی۔ مثلاً نواب امین الدین خاں برابر ”دارو مریز“ میں رہے۔ دونوں رخ سنبھالے رکھنا چاہتے تھے۔ قرین قیاس ہے کہ مرزا غالب کی روش بھی ایسی ہی رہی ہوگی لیکن یہ بات کہ غدر ہوتے ہی وہ خانہ نشین ہو کر بیٹھ رہے اور قلعہ سے بالکل غیر متعلق ہو گئے کسی بھی طرح قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ اور پھر اگر مان بھی لیا جائے کہ مرزا غالب نے قلعہ سے قطع تعلق کر کے خانہ نشینی کا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ بات کیوں کر باور کی جا سکتی ہے کہ قلعہ کے لوگوں نے اور خصوصاً نودولت شہزادوں اور فوجی سرداروں نے انہیں اس ارادہ پر عمل کرنے کی مہلت دی ہوگی۔ وہ بہادر شاہ کے شاعر تھے۔ اور بہادر شاہ اب شہنشاہ ہند بنائے گئے تھے۔ دربار کے مجمع میں ان کی جگہ بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔ ناگزیر تھا کہ ان کا نام زبانوں پہ آتا اور یہ بات کھٹکتی کہ مرزا غالب کہاں چھپے بیٹھے ہیں۔

بے تعلقی ممکن نہ تھی

غدر ۱۰ مئی مطابق ۵ رمضان کو شروع ہوا اس طرح پے درپے دو عیدیں آئیں اور دونوں عیدوں کے بارے میں قلعے کے دفتری روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلف اہتمام کیا گیا اور شعرا نے تہنیت کی نظمیں پیش کیں۔ کیا اس موقعے پر غالب چھپے بیٹھے رہ سکتے تھے؟ اور اگر ایسا کرتے تو کیا شہزادوں کی دارو گیر اور فوجی افسروں کی سختیوں سے بچ سکتے تھے۔

سب کو معلوم تھا کہ انگریزوں کے متوسل اور مداح رہ چکے ہیں۔ اگر ان کی جانب سے ذرا بھی پہلو تہی ہوتی تو فوراً نظروں میں چڑھ جاتے۔

والیٔ لوہارو کا واقعہ

لوہارو والوں نے آمد ورفت جاری رکھی دربلوں میں بھی شریک ہوئے تاہم چونکہ انگریزوں کے متوسل تھے اور واقعی درپردہ انگریزی کیمپ سے سامر وپیام رکھتے تھے اسلئے شہزادوں اور فوجیوں کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ایک دن انہیں پکڑ کر دیوان عام میں کھینچ لائے۔ انگریزوں سے سازباز رکھنے کا الزام لگایا۔ نواب امیر الدین خاں مرحوم کہتے تھے۔ امین الدین خاں (والی لوہارو) بڑے طاقت ور اور تہور ور آدمی تھے کہولت تک یہ معمول رہا کہ ہر روز ایک بکرے کی یخنی سے ناشتہ کرتے جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں سے نکلنا دشوار ہے۔ تو بہادر شاہ کے ایک پوتے کو کہ قریب بیٹھا تھا۔ کمر سے پکڑ کر اٹھا لیا اور سپر کی طرح سامنے رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کہا میں واپس جاتا ہوں۔ اگر کسی شخص نے وار کیا تو اس سپر پر روکوں گا۔ لوگ ششدر ہو کر رہ گئے۔ وہ اسی طرح لڑکے کو اٹھائے ہوئے نقارخانہ تک آئے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سامنے بٹھایا اور بخیر وعافیت گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچکر شاہزادے کی خاطر تواضع کی اور اپنے سواروں کے ساتھ پالکی میں بٹھا کر قلعے پہنچا دیا۔ انہیں شاہ غلام علی رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہ سے ارادت تھی۔ شاہ ابو سعید کے مرید تھے خانقاہ میں ہمیشہ پٹھانوں کا ایک بڑا جمگھٹا حاضر رہتا تھا۔ انہوں نے وہاں کے پٹھانوں کو بلا کر اپنی حویلی کی پاسبانی پر مسلط کر دیا تھا۔ چونکہ اس حادثے کی تمام شہر میں شہرت ہو گئی تھی اور قلعہ کے روزنامچہ میں بھی بہ تفصیل درج کیا گیا تھا جو حکیم احسن اللہ خاں کی وجہ سے

توجہ نہیں کی۔ کیونکہ وہ مطمئن تھی کہ بہادر شاہ کے بعد حسب شرط پر ولی عہد کو مجبور کیا جائے گا وہ منظور کرے گا۔

زینت محل کا پیام یہ تھا کہ میں اپنا اثر کام میں لاکر بہادر شاہ کو تیار کردوں گی کہ انگریزوں کے پاس چلا جائے، بشرطیکہ تمام شاہی خاندان کی جان و عزت کے تحفظ کا وعدہ کیا جائے۔ بدستور سابق قلعہ میں قیام رہے اور بدستور سابق وظیفہ جاری ہو جائے۔

ہڈسن لکھتا ہے "یہ کہنا ضروری نہیں کہ ان شرائط کو پوری نفرت سے نامنظور کر دیا گیا۔ اور اس طرح کی خبریں مشہور کر دی گئیں کہ قطب کی طرف فوجی اقدام بہت جلد ہونے والا ہے"

بہادر شاہ کے ساتھ دھوکا

ہڈسن کا یہ بیان کہ زینت محل کی پیش کردہ شرائط نامنظور کر دی گئیں صحیح نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے تمام پیاموں کے جواب گول مول دیئے گئے اور الٰہی بخش اور رجب علی سے کہہ دیا گیا، کہ وہ اپنے طور پر ان امور کی نسبت جس قدر اطمینان دلا سکتے ہیں ضرور دلائیں۔ تاکہ بادشاہ بخت خاں اور نصیر آباد والی فوج کے ساتھ نکل جانے کا قصد نہ کرے۔ بادشاہ اور زینت محل جب مقبرہ سے نکل کر ہڈسن کی حفاظت میں آئے ہیں تو انہیں یقین تھا کہ اصلاح حال کی کچھ نہ کچھ راہ ضرور نکلے گی۔ دہلی کے لوگوں کا یہ عام یقین تھا کہ اگر الٰہی بخش نے اور احسن اللہ خاں نے دھوکا نہ دیا ہوتا تو بہادر شاہ کبھی اپنے کو حوالے نہ کرتے۔ قلعہ سے نکلتے ہوئے انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ بخت خاں کے ساتھ لکھنؤ جا بیٹھیں گے

قیدی بادشاہ کی حالت

لندن ٹائمز کے ایک خاص نامہ نگار ولیم ہاورڈ رسل نے کمشنر کے ساتھ جا کر بادشاہ کو دیکھا تھا اسوقت ان کا مقدمہ ہو چکا تھا اور حکومت سوچ رہی تھی کہ ان کو کہاں بھیجا جائے قلعے کے ایک مکان میں مقید تھے جو دیوان خاص کے پچھواڑے واقع تھا۔ چٹائی کا فرش، بان کی چارپائی، اور چار خدمت گار مہیا تھے۔ ململ کا ایک میلا کرتا پہنے ہوئے چار زانو بیٹھے تھے اور کھانس کھانس کر آمانے میں تھوک رہے تھے کمرہ میں ایک دروازہ اندر جانے کے لئے تھا جس پر پردے کی جگہ چٹائی لگا دی گئی تھی۔ زینت محل اور جواں بخت کی بیوی یہاں رہتی تھیں۔

حزنیہ اشعار

رسل ازراہ طنز لکھتا ہے کہ یہ مجسٹی شاعر بھی ہیں اور چار دیوان مرتب کر چکے ہیں۔ انہوں نے دو نئے شعر تصنیف کئے تھے اور اپنے قید خانے کی دیوار پر ایک جلی ہوئی لکڑی کے سرے سے لکھ دیئے تھے رسل لکھتا ہے کہ کمشنر بیگم سے گفتگو میں مشغول ہو گیا۔ پردہ کی آڑ سے آواز آرہی تھی۔ اس کی عمر ۳۵ سال کی بتائی جاتی ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہی تھی

کہ یہ اولڈ فول (کسی اردو لفظ کا ترجمہ کیا ہے) ابھی تک اسی خیال میں مگن ہے کہ بادشاہ ہے۔ میں اس کے ہاتھوں عاجز آچکی ہوں اور اس سے نجات چاہتی ہوں۔

بدنصیب بہادر شاہ

افسوس اگر بدنصیب بہادر شاہ نے چھیاسی برس کی عمر میں اور جینے کی تمنا جی سے نکال دی ہوتی اور اپنے کو ریلی یا تراتی کے میدان میں مرنے دیا ہوتا تو اس کی یاد دنیا کے لئے کس درجہ شاندار ہوتی۔

واذا لم یکن من الموت بد
فمن العار ان یکون جبانا[1]

حکیم احسن اللہ خاں

حکیم احسن اللہ خاں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ طیار ہو گئے کہ بادشاہ کے خلاف شہادت بھی دیں۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کہتے تھے کہ غدر کے بعد جے پور میں ملازم ہو گئے تھے اور گاہ گاہ دہلی آتے تھے مگر لوگوں کی نظروں سے اس درجہ گر چکے تھے کہ انہیں عوام کے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ بالکل خانہ نشین رہتے۔

غدر میں قلعے سے غالب کا تعلق

غالب کا بیان

کیا واقعی مرزا غالب غدر کے مہینوں میں قلعہ سے بالکل بے تعلق رہے اور وہاں کی تقریبوں میں شریک نہیں ہوئے؟ مجھے اس میں شک ہے سکوں کا الزام یقیناً غلط ہوگا۔ لیکن یک قلم بے تعلقی سمجھ میں نہیں آتی غدر کے بعد مرزا صاحب نے ایسا ہی ظاہر کرنا شروع کیا اور بے بس کر دینے والے حالات کا تقاضا بھی ایسا ہی تھا لیکن انہوں نے ۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو جو فارسی خط نواب یوسف علی خاں کے پاس بھیجا تھا اور جو اب رامپور کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے۔ اس میں یک قلم بے تعلقی کا دعویٰ نہیں کرتے۔ بلکہ صاف صاف اعتراف کرتے ہیں۔

"پیوند تعلق با بہادر شاہ جز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال بہ
تحریر تاریخ سلاطین تیموریہ و از دو سہ سال بہ اصلاح اشعار
شہریاری پرداختم درین ہنگامہ خود را یکبار کشیدم و دریں اندیشہ
کہ مبادا اگر یک قلم ترک آمیزش کنم خانہ من تاراج رود و جان

---

[1] جب موت سے کسی حال میں بھی مفر نہیں تو پھر یہ امر کس درجہ باعث ننگ ہے کہ ہم بزدل بن جائیں۔

۱۹۰۶ء کی یاد

خلیفہ صاحب کو اس رباعی کا چوتھا مصرعہ یاد تھا اور انہوں نے سنایا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے ذہن سے اُتر گیا یہ بات دسمبر ۱۹۰۶ء کی ہے۔ جب میں مولانا شبلی مشتاق حسین[1]، خلیفہ صاحب اور تمام ڈیلی گیٹس ہم سفر ہوئے تھے۔ گوالندو[2] میں جب اسٹیمر میں سوار ہوئے تو مولانا شبلی مرحوم، خلیفہ صاحب اور میں ایک کیبن میں چلے گئے۔ پھر وہاں محمد علی مرحوم اور مولوی رفیع الدین بھی آ گئے تھے۔ مرزا غالب کا ذکر نکلا تو خلیفہ صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا۔ ہم چونکہ جاتے ہی کیبن میں بیٹھ گئے تھے۔ اور ڈائننگ ہال میں نہیں گئے تھے۔ اس لئے چائے سے محروم رہ گئے تھے۔ میں نے چائے کے لئے کہلوایا تو جواب ملا چائے ختم ہو گئی ہے۔ اس پر خلیفہ صاحب نے مسکراتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا۔

"کہ اب تو کچھ نہیں باقی جناب شیشے میں"

اس واقعہ پر ۳۳ برس گذر گئے۔ لیکن اب تک خلیفہ صاحب کا ثقہ اور سنجیدہ چہرہ، پٹیالہ کی بڑی درباری پگڑی اور اس پر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ یہ رندانہ مصرعہ پڑھنا میری نگاہوں میں پھر رہا ہے۔ افسوس یہ صورتیں بھی باقی نہ رہیں۔

"چوں دور خسرو آمد سے در سبو نہ ماندہ!"

التجاؤں سے اعراض

مرزا غالب نے مرنے سے ایک سال پہلے دو باتوں کے لئے بار بار التجائیں کی تعبش[3] ایک یہ کہ حسین علی خاں کی شادی کے لئے کچھ اعانت ہو جائے۔ دوسری یہ کہ اسکے لئے ۲۵ روپیہ وظیفہ مقرر ہو جائے۔ جب کئی ماہ گذر گئے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ادھر قرض خواہوں کے تقاضوں پہ تقاضوں سے عزت پر آ بنی تو مرنے سے تین ماہ پہلے یہ درخواست کی کہ مجھے صرف آٹھ سو روپیہ مل جائیں، کہ قرض سے سبک دوش ہو جاؤں۔ حسین علی کی شادی اور اس کے نام کے وظیفہ سے در گذرا۔ میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ میں ہے جو عطا فرمانا ہو جلد عطا فرمایئے۔ امرائے ہند کی ناحق شناسیوں اور قدر فراموشیوں کی تاریخ کا یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس گدایانہ فریاد کا بھی جو عہد کے سب سے بڑے باکمال فن نے عجز و پیری کے بستر مرض سے کی تھی کوئی جواب نہیں ملا اور اسے صرف آٹھ سو روپیہ کے لئے قرض داروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے قبر میں جانا پڑا۔

بیگم کی درخواستیں

جب مرزا کا انتقال ہو گیا تو ان کی بیوی نے بہم عرائض کلب علی خاں کو بھجوائے۔ ایک عریضہ میں لکھتی ہیں کہ مرزا آٹھ سو کے قرض دار مرے۔ وفات کے ساتھ ہی دونوں وظیفے بند ہو گئے۔ گورنمنٹ کا بھی اور رام پور کا بھی اب نوبت فاقہ کشی کی پہنچ گئی ہے۔ امید نہیں ہیں برس چھ مہینے سے زیادہ اور جیوں گی۔ اور میرے لئے کچھ حکم ہو جائے۔ لیکن کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ نواب امیر الدین مرحوم (لوہارو) کہتے تھے کہ نواب ضیاء الدین مرحوم نے قرض داروں سے کچھ رقمیں معاف کرائیں باقی رقم اپنے پاس سے دیدی تھی۔ اور جب رام پور کی طرف سے بالکل ناامیدی ہو گئی، تو لوہارو سے ایک رقم امراؤ بیگم (مرزا کی بیوی) کے لئے ماہ بہ ماہ جانے لگی۔

یہ اس شخص کا حال تھا جس کی قدر دانیوں کی تمام شمالی ہند میں دھوم تھی۔ یعنی کلب علی خاں کی۔

قدر دانیوں کی حیثیت

اصل یہ ہے کہ لکھنؤ مٹ چکا تھا۔ وہاں کے ارباب ہنر کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ چند باورچی، چند فراش، چند بیچوان بردار، دو چار طبیب، چار پانچ شاعر رام پور پہنچ گئے اور نوکر ہو گئے۔ اسوقت کی بربادیوں میں اتنا سہارا بھی بہت تھا۔ لوگوں نے قدر دانیوں اور فیاضیوں کے افسانے مشہور کر دیئے۔

---

[1] وقار الملک۔ [2] یہ سفر ڈھاکہ کا واقعہ ہے۔ کلکتہ سے گوالندو تک ریل پر جاتے تھے پھر اسٹیمر کے ذریعے نرائن گنج پہنچتے تھے۔ جہاں سے ڈھاکہ صرف بارہ تیرہ میل ہے [3] نواب کلب علی خاں (رامپور) سے۔

انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ اس لئے اس خاندان کے بچاؤ کے لئے ایک دلیل قاطع بن گیا۔ جب فتح دہلی کے بعد یہ پرسش ہوئی تو امین الدین خاں نے اپنی بے گناہی کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کر دیا۔ قلعے کے روزنامچے سے بھی اس کی تائید ہوئی۔ اور ان کی بے گناہی تسلیم کرنی پڑی۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن پھر بھی لوٹ مار سے نہ بچ سکے۔ بصیر آباد والی فوج کے افسروں نے ان کی اور ان کے بھائی کی حویلیاں لٹوا دیں۔

قرین قیاس روش

احسن اللہ خاں اور محبوب علی[1] بادشاہ کے متوسل خاص اور معتمد علیہ خاص تھے مگر ان دونوں پر جو گذری وہ معلوم ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ان لوگوں کا یہ حال ہوا تو کیا ممکن تھا کہ بے چارے مرزا غالب بے تعلق اور گوشہ گیر رہ کر دار و گیر سے بچ سکتے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے بخوف جان و مال بظاہر آشنائی رکھی۔ یہ ٹھیک ہے، مگر رکھی اور اس طرح رکھی جس طرح دوسروں نے رکھی تھی۔ دوسرے کچھ نہ کچھ طاقت اور سامان بھی رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ اس طرح کی بھی کوئی بات نہ تھی۔ یہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ مجبور ہوئے ہوں گے۔ اور ان لوگوں سے کہیں زیادہ اظہار تعلق کیا ہوگا۔ علاوہ بریں یہ قلعے کے ملازم تھے۔ ممکن نہ تھا کہ دولت خواہی کے اظہار سے باز رہ سکے ہوں۔

سعیٔ اخفا

بہر حال صحیح بات وہی ہے جو یوسف علی خاں والے خط میں لکھی ہے "بدیں اندیشہ کہ اگر یکسر قلم ترک آمیزش کنم خانہ من بتاراج رود و جاں درمعرض تلف افتد بباطن بیگانہ و بہ ظاہر آشنا ماندم"

یعنی غدر کے بعد قلعے اور بہادر شاہ سے ان کی "آمیزش" جاری رہی اور بدستور آشنا و دولت خواہ رہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہی ہوسکتی ہے کہ وہ قلعہ میں حاضری دیتے رہے اور وقت و حالات کے لحاظ سے اظہارِ دولت خواہی و وفاداری کیلئے جو کچھ کرنا ضروری تھا بظاہر اس سے اعراض نہیں کیا اب رہی یہ بات کہ ان معاملات کی مزید تفصیلات کیا ہیں؟ تو افسوس ہے کہ انکے علم کا کوئی ذریعہ نہیں رہا بعد کے حالات نے غالب کو مجبور کیا کہ جہاں تک ممکن ہو ان حالات کو مخفی رہنے دیں، اور کوئی ذریعہ انکے انکشاف کا ابھر نہ سکے

طالب کا بیان

میں نے ایک مرتبہ طالب مرحوم سے اس بارے میں گفتگو کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بات میرے سننے میں بھی آئی ہے کہ غدر کے بعد جب عید آئی تو غالب نے حسب معمول تہنیت کا قصیدہ لکھا اور پیش کیا۔ یہ قصیدہ ان کے دیوان فارسی میں موجود ہوگا۔ مگر معلوم نہیں کون قصیدہ ہے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ جب شہزادوں اور فوجی سرداروں نے مجبور کر کے دیوان عام کا دربار کرایا۔ اور ایک سو ایک توپیں شہنشاہ ہندوستان کی سلامی کی چھوڑی گئیں۔ تو شعراء کو حکم ہوا کہ تہنیت کے قصائد پیش کریں۔ مجبوراً مرزا غالب کو ایک قصیدہ لکھنا پڑا۔ مگر یہ قصیدہ یا قطعہ (انہیں شک تھا) اردو کا تھا۔ اور چونکہ اس میں وقت و تقریب کی خصوصیات کی طرف اشارہ تھا اسلئے مرزا نے بعد کو ضائع کر دیا۔

قصیدہ ضرور پیش کیا ہوگا

روزنامچے کا یہ واقعہ مجھے غلط نہیں معلوم ہوتا۔ بالکل قرین قیاس ہے۔ غالب کو ضرور قصیدہ پیش کرنا پڑا ہوگا کسی طرح اس سے نہیں بچ سکتے تھے یوسف علی خاں کے خط میں خود انہوں نے آمیزش رکھنے کا اعتراف کیا ہے

طالب مرحوم کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے خاندان میں یہ بات مشہور تھی۔ کہ غدر میں مرزا نے کوئی قصیدہ لکھا تھا جو انہوں نے ضائع کر دیا۔ اور دیوان میں شامل نہیں کیا۔ ایک آدھ قطعہ کا بھی ذکر انہوں نے سنا تھا۔

بعد غدر کا ایک دربار

خلیفہ محمد حسین مرحوم (پٹیالہ) نے مجھ سے دہلی کے ایک دربار کے بعد غدر کا ذکر کیا تھا۔ جس میں وہ شریک ہوئے تھے۔ اور مرزا غالب کو دیکھا تھا۔ مرزا صاحب پر ضعف سے چلنا دشوار تھا۔ دو شخص دونوں طرف سے سہارا دیکر انہیں لفٹنٹ گورنر کے پاس لائے۔ ان کے ہاتھ میں زر افشاں کاغذ تھا جس پر ایک رباعی درج تھی جب روبرو پہنچے تو کہا کانوں سے بہرا ہوگیا ہوں۔ ارشاد مبارک سُن نہیں سکتا آنکھوں کی بصارت جواب دے رہی ہے۔ جمال مبارک دیکھ نہیں سکتا۔ فکر شعر کی طاقت نہیں رہی کہ قصیدہ لکھ کر حدمت دولت خواہی بجا لاتا۔

رسم است کہ مالکان تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

اس عجز و خستگی میں ایک رباعی عرض کرکے دل کی حسرت نکالی ہے۔ امیدوار مقبولیت ہوں۔"

یہ کہہ کر رباعی پڑھی اور کاغذ بطور نذر کے ہاتھوں پر رکھ کر پیش کیا۔ لفٹنٹ گورنر نے رباعی لے کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور بہت زور سے پکار کر کہا (تاکہ وہ باوجود ثقل سماعت سُن سکیں) آپ کا قدیم اعزاز بحال ہوا آپ حضور گورنر جنرل بہادر کے دربار میں بھی بدستور خلعت پائیں گے۔ پھر اپنے ہاتھ سے مالائے مروارید اور سرپیچ سر پر باندھ دیا۔ اور میر منشی نے خلعت کے بقیہ اجزاء عطا کئے۔

---

[1] خواجہ سرا جو دوران غدر ہی میں فوت ہوگیا تھا

[1] جیون لال نے جو انگریزوں کا جاسوس تھا لکھا تھا کہ انگریزوں پر فتح کی خوشی میں جو دربار ہوا اس میں غالب نے بھی قصیدہ پڑھا تھا۔

نیاز حیدر

مردِ مجاہد

وہ مجسم ہے ابھی تک وہ ابھی موجود ہے　　اس کی ہستی زندگی کی طرح لامحدود ہے
اس کی شانِ انقلابی کے سبب ہر عصرِ نو　　آئے گا انساں کی خدمت میں لے کر نذرِ نو
دل بہ دل، منزل بہ منزل، شادماں و شادکام　　چشمِ باطن دیکھتی رہتی ہے اک رقصِ دوام
روضۂ اقدس پہ جاری ہے طوافِ صبح و شام　　اور بدلتا جا رہا ہے زندگانی کا نظام

وہ تبسم جس کی خاطر مضطرب ہو آرزو　　مر مٹیں پروانے جس پر، شمع وارے آبرو
دہشت و طوق و سلاسل، بربریت، جبر و جور　　ظلم جتنا ہو بغاوت گرم ہو جاتی ہے اور

جس نے طوفانوں کی طاقت سے بچائے آشیاں　　برقِ سامانی سے پیدا کی بہارِ گلستاں
جو خداؤں کو بھی جھٹلا دے یہ بندہ ہے وہی
جو کلیسا میں نہیں ہے یہ مسیحا ہے وہی
بند توپوں کے دہن، مرجھائے سنگینوں کے وار　　چلتے چلتے روند ڈالے جانے کتنے خار زار
چشمِ بینا ہو تو صاحب، حاضر و ناظر ہے وہ　　جسکے مہرے چاند سورج ہیں یہی شاطر ہے وہ
اس کے سرہانے عرب کی سرزمیں آزاد ہے
اور مکانِ ایشیا کا ہر مکیں آزاد ہے
دیکھ لیں گے ہم کہ اب ساری زمیں آزاد ہے

اُردو کانفرنس میں مولانا آزاد کی آخری یادگار تقریر

۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو اُردو کانفرنس، منعقدہ پریڈ گراؤنڈ دہلی میں مولانا آزاد نے
یہ آخری تقریر کی تھی۔ کیا خبر تھی کہ ٹھیک ایک ہفتہ بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وہ ہمیشہ
کے لئے ہم سے رخصت ہو جائیں گے اور پھر کبھی ان کی آواز ہمارے کانوں میں نہ آسکے گی۔

(ادارہ)

جناب صدر اور دوستو!

جہاں تک مجھے اندازہ ہوا ہے، آج آپ نے یہ مجلس اس لئے منعقد کی ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی زندگی میں اُردو کی جو واقعی جگہ ہے، وہ ملنی چاہیئے، یہ نہیں کہ کسی زبان کی جگہ خالی کی جائے، اور وہ اسے دی جائے۔

آپ اُردو کے حامی ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں، جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سندر لال) نے کہا ــــ یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو۔ یہی صحیح اسپرٹ ہے، اور اسی اسپرٹ سے حل کا راستہ صاف ہوتا ہے۔ تیس یا چالیس سال پہلے زبان کے بارے میں یہ جھگڑا اٹھا، کہ ملک کی زبان کیا ہو۔ جو لوگ اُردو کے حامی تھے، وہ چاہتے تھے کہ اُردو ملک کی زبان ہو، اور جو ہندی کے حامی تھے، ان کی خواہش تھی کہ ہندی ہو۔ یہ معاملہ اسوقت گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اُردو والے کہتے تھے کہ اگر ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کیا گیا تو اُردو ختم ہو جائے گی، اور ہندی والے کہتے تھے کہ اگر اُردو کو ملک کی زبان مان لیا گیا تو ہندی ختم ہو جائے گی۔ ہم ہر وقت اس نگاہ سے اس سوال کو دیکھتے تھے، اور اسی کے عادی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب یہ سوال سامنے آیا تو اسی ترازو میں تولا جاتا۔ اسی حالت میں ملک آزاد ہوا، وقت آیا، دستور بنا۔ اسمبلی میں کافی بحث ہوئی۔ اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں اُردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب آگیا۔ اور اُردو کی بات ایک رقیب کی حیثیت سے کم ہو گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے، فرض ہے کہ اسے ملے۔ وہ اسکے خلاف نہیں جا سکتا اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کی کیا جگہ ہے۔ اس کی وہی حیثیت ہے جو دوسری زبانوں کی ہے، بہت سے لوگ اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں، حالانکہ اب یہ بات نہیں ہے اب یہ سوال تو اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کون سی ہوگی ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اُسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا خاص فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے، لیکن اسی کے ساتھ اُردو کی جو جگہ ہے، وہ اسے ملنی چاہیئے اُردو ایک ایسی زبان ہے جو کثرت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدر آباد، تلنگانہ کے علاقے میں اُردو بولی جاتی ہے۔ میسور میں لاکھوں آدمی اُردو بولتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے یوپی، بہار، دِلّی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں کے لاکھوں اور ہزاروں آدمی اُردو بولتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کیلئے بلائی گئی ہے، اس میں اسے کامیابی ہوگی۔ اور جبکہ وزیر اعظم نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی ــــ

ابوالکلام آزاد

شاہراہ

عصر نو میں اے دیارِ فقر و دیں کے تاجدار
تیرے دل کا صدق تھا تیری نظر سے آشکار
جلوہ آرا نور قرآنی ترے سینے میں تھا
جوہر خورشید تیرے دل کے آئینے میں تھا

نالہ کش ہیں موت پر تیری ادیبانِ وطن
گریہ ساماں ہیں سراپا نغمہ سنجانِ وطن
کچھ خبر بھی ہے تجھے او عظمت و شانِ وطن
ہم نے یوں دیکھی نہ تھی صبح پریشانِ وطن

زندگی جن کے لئے ہے امتحاں تیرے بغیر
اب سنائیں کس کو اپنی داستاں تیرے بغیر

کیا بتائیں ہم ترے جانے سے کیا جاتا رہا
کشتیٔ علم و ادب کا ناخدا جاتا رہا
ہند کے اہلِ قلم کا آسرا جاتا رہا
تیرے دم سے تھا جو باقی حوصلہ جاتا رہا

جانے والے اک تیرے جانے سے کیا باقی نہیں
زندگی کی بزم باقی ہے مگر ساقی نہیں

گرچہ اے دہلی! ترے دل میں دفینے ہیں بہت
تیرے ہر گوشے میں پوشیدہ خزینے ہیں بہت
تیری مٹی میں نہاں بیتاب سینے ہیں بہت
تو وہ دریا ہے کہ گم تجھ میں سفینے ہیں بہت

جگن ناتھ آزاد

ابوالکلام آزاد

بوالکلام، اے کاروانِ علم و حکمت کے امیر
مرشد روشن بصر، روشن دل و روشن ضمیر
آسمانِ جذبۂ اخلاص کے مہرِ منیر
تو نے دنیا کو دکھادی عظمت و شانِ فقیر

فاش تھی تیری نگاہوں پر نمودِ زندگی
تیرا ہر نکتہ ضمیر اندر وجودِ زندگی

علم کی محفل میں گاہے درفشاں گاہے خموش
زندگی کے معرکے میں پختہ کار و سخت کوش
اے فقیر خوش کلام و نرم خوئے و سادہ پوش
ہائے تو کتنا ادائے فرض میں تھا گرم جوش

تیری نظروں پر عیاں تھا روزگارِ شرق و غرب
تیری حکمت تھی سراپا رازدارِ شرق و غرب

تیرے دم سے تھا سیاست کو بھی حاصل اک وقار
تیری سطوت ملک و دولت کیلئے سنگیں حصار

نشتر خانقاہی

روح کی آواز

میں اپنی اس نظم کو مولانا آزاد کی روح کے نام معنون کرنے کی گستاخی اور جرأت کا مرتکب ہو رہا ہوں (نشتر خانقاہی)

دوستو! اس اندھیر نگری میں
کتنے دیپک جلائے ہیں میں نے
آدمیت کے برف خانے میں
آتشیں گیت گائے ہیں میں نے

•

اور پھر بھی، تمام دنیا پر
بیکراں تیرگی مسلط ہے
زندگی کی اداس محفل میں
کوئی نغمہ، نہ کوئی بربط ہے

•

آج لیکن تجھ میں اک فخرِ زمیں خوابیدہ ہے
پیکرِ صدق و صفا و علم و فن خوابیدہ ہے
جس کی ساری داستاں تھی داستانِ علم و فن
جس کی موجِ نطق سے آباد تھا اپنا چمن
جس کو کہیے آبروئے شیخ و فخرِ برہمن
آج سوتا ہے تری مٹی میں وہ نازِ وطن
نور سے معمور اک ہیرا ترے دامن میں ہے
جس نے ظلمت کا جگر چیرا ترے دامن میں ہے
ناز کر بختِ رسا پر ارضِ دہلی ناز کر
تیری خاکِ پاک میں پنہاں جو ہیں لاکھوں گہر
آج شامل ان میں ہے وہ صاحبِ ذوقِ نظر
فکر جس کی تھی تجلی بخشِ خورشید و قمر
کیا کہوں دہلی تجھے کیا سروری حاصل ہے آج
تیری مٹی کو فلک پر برتری حاصل ہے آج
اے غلاموں کا لہو گرمانے والے الوداع
آگ سی الفاظ میں برسانے والے الوداع
خود تڑپ کر بزم کو تڑپانے والے الوداع
اے جگا کر ہند کو سو جانے والے الوداع
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حسن حمیدی

مرگِ احساس

گنگ نغموں کی زباں زیست کی لے مُہر بلب
سرد ہے آتشِ دل، ڈوب گئی نبضِ طرب
خوف سے جذبۂ احساسِ وفا کا منہ فق
چُپ ہیں یوں جیسے کہ آغوشِ مقابر میں ہوں سب
دل بھی دھڑکے تو رقیبوں کو خبر ہو جائے
کتنی پُرہول ہے خاموشیِ تاریکیِ شب

تُربتِ چشم ہے اشکوں کے جنازوں کو چھپائے
کس میں ہمت ہے کہ رِستے ہوئے ناسور دکھائے

تیرگی قسمتِ صاحب نظراں ہے شاید
یا سیہ پوش ابھی صبحِ جواں ہے شاید
نطق و لب موردِ الزام یہ تنظیم سکوت
دل کی آنکھوں سے ابھی اشک رواں ہے شاید
آئی اور آ کے یہاں ظلمتِ شب تھم سی گئی
وقت کے پاؤں میں زنجیر گراں ہے شاید

ہاں! گوارا ہے ہمیں جرأتِ اظہار کی موت
مرگِ احساسِ وفا ہے دلِ فنکار کی موت

جیسے میری زبان مہمل تھی
یا سماعت پہ ان کی پہرے ہیں
یا مری چیخ دل خراش نہ تھی
یا مرے سامعین بہرے ہیں

(۲)

دوستو! زندگی کے چہرے کو
اپنے ہاتھوں سے بے نقاب کرو
دوستو! دیس کے جوانوں کو
مری جانب سے یوں خطاب کرو

●

عمر کے مختصر سے لمحے کو
رات دن کے گزوں سے مت ناپو
اس کے پنجے گڑے ہیں ماضی میں
اور سر چھو رہا ہے فردا کو

●

کامرانی کا مختصر لمحہ ــــــــ
زندگی سے فرار کرتا ہے
وقت کا انتظار کیا معنی
وقت کب انتظار کرتا ہے

●

ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کر لینے کے ساتھ ہی یورپ کی لوالہوس قوموں نے ہندوستان کی منڈیوں سے زیادہ سے زیادہ مال خریدنے اور اس کی اجارہ داری حاصل کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دی۔ ان میں پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز شامل ذکر ہیں، دو صدیوں تک یہ رسہ کشی جاری رہی۔ حالات کی روش نے بالآخر یہ بات صاف کر دی کہ تجارتی کامیابی کے ساتھ ساتھ سیاسی کامرانی انگریزی قوم کے حصے میں آئے گی۔

ان دو صدیوں میں مغلوں کی سلطنت نے، جس کی بابر نے طرح ڈالی تھی، اور جس کو اکبر نے پروان چڑھایا تھا، عروج کی منزلیں طے کیں۔ مغلوں کی عظمت کا آخری امین شاہ جہاں تھا۔ اورنگزیب کے برسر اقتدار آتے ہی مغلوں کے اس عظیم الشان ڈھانچے کی چولیں ہل گئیں، جس کو اکبر اور اس کے بیدار مغز رفیقوں نے متحدہ قومیت کے اصولوں پر کھڑا کیا تھا۔ اکبر کی دوررس نگاہوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اس ملک میں جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے آباد ہیں سلطنت کو استحکام بخشنے کے لئے ضروری ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ کر دیا جائے۔ تاریخ ہند کا یہ پہلا اور انوکھا تجربہ تھا جو غیر محسوس طور پر تاریخ کی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں کو پورا کر رہا تھا۔ اور اس کی تعمیر میں دیر و حرم نے برابر کا حصہ لیا تھا۔ شاہجہاں کے بعد اگر دارا شکوہ کو فرماں روائی کا موقع ملتا، تو باپ اور دادا دونوں سے بہتر وہ اپنے پردادا کا جانشین ہوتا۔

"سلسلۂ مغلیہ میں بقول ابوالکلام آزاد" دارا شکوہ عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گزرا ہے اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا۔ اسی لئے اصل تصویر پولیٹکل تاریکیوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی۔ وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دستبرد حوادث سے بچ گئی ہیں، شہادت دیتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں۔ اس کے صاحب ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی، اور جس نیازمندی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا، ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں کے ساتھ رکھتا تھا، اس اصول سے کون صاحب ذوق انکار کر سکتا ہے، کیونکہ اس عالم میں بھی کفر و اسلام کی تفریق باقی رہی تو پھر عامی و بصیر میں کیا فرق باقی رہا؟ پروانہ اگر حرم ہی کا شیدا ہے تو سودا طلبی کامل نہیں۔

عاشق ہم از اسلام خراب است ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر ندارد

یہ مغلوں کی کم نصیبی تھی کہ اکبر کے انتقال کے ۵۳ سال بعد، حالات کی سازش نے ولی عہد سلطنت دارا شکوہ کو محروم کر کے اورنگزیب کو مسند حکومت پر متمکن کر دیا، جس کے ذہن کا خزانہ تدبر و مآل اندیشی کے اس جوہر سے ایک حد تک تہی تھا، جو اکبر کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اور اس کا دل وسیع المشربی کی اس دولت سے یکسر خالی تھا جس سے اکبر کو قدرت نے بڑی فیاضی سے مالا مال کیا تھا اورنگزیب نے اپنی "عالمگیری" کی بنیاد اکبر کی نفی پر رکھی اور اس نے ان تمام روایتوں سے انحراف ضروری سمجھا جو اکبر نے وضع کی تھیں، اور جنکی جہانگیر و شاہجہاں نے پیروی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گرد و پیش کی وہ تمام طاقتیں اورنگزیب کے خلاف صف آرا ہو گئیں، جن کو اکبر کے تدبر نے اس کا حلیف بنا دیا تھا۔ ایک طرف تو مذہبی احیا کی وہ تحریکیں تھیں از سر نو زندہ ہو گئیں، جن کو اکبر کے تدبر نے بے جان کر دیا تھا۔ دوسری طرف مرہٹوں، راجپوتوں، سکھوں، جاٹوں اور افغانوں میں نسلی وقار کا ایک مبہم تخیل ابھرا، جس نے جلد ہی واضح شکل اختیار کر لی اور یہ نوزائیدہ احساس اور رنگ رس کی منتشر لڑی حکومت کے لئے وبال جان بن گیا۔ سکھوں نے پنجاب میں افغانوں[1] نے

---

[1] افغانوں کا معاملہ اس اعتبار سے دلچسپ و قابل ذکر ہے کہ وہ اورنگزیب کے ہم مذہب ہونے کے ساتھ مذہبی معتقدات میں اس سے زیادہ کٹر تھے۔ افغانوں کی بغاوت کا سرغنہ پشتو کا مایہ ناز شاعر خوشحال خان خٹک بقول محمد اکرام "صاحب السیف والقلم تھا" اور اس عزم کے ساتھ وہ میدان میں اترا تھا کہ

"یا تو مغل دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں یا افغان تباہ ہو جائیں"

خوشحال خان افغانوں کو منظم کرنے کی اس طرح کوشش کر رہا تھا جس طرح گورو گوبند سنگھ سکھوں کی اور سیواجی مرہٹوں کی تنظیم میں کوشاں تھے۔

(محمد اکرام، رود کوثر لاہور۔ ص ۵۰۲-۵۰۳) باقی صفحہ

محمد عتیق صدیقی

مولانا آزاد کا ذہنی پس منظر

ابوالکلام آزاد کی لامحدود شخصیت اور ان کی ہمہ گیر زندگی جس کے ایک ایک گوشے میں لاتعداد انجمنیں اور ان گنت محفلیں برپا تھیں — ہندوستان کی مذہبی، علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ میں ایک فرد کی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ ان کا وجود ہماری تاریخ کا ایک اہم ترین عہد تھا، جس کی پشت پر شاندار عروج کی عظمت داستانوں، زوال کی عبرتناک کہانیوں، جہد آزادی کے ولولہ انگیز کارناموں اور تعمیر نو کی انتھک کوششوں کی مربوط و مسلسل تاریخ تھی —

ابوالکلام آزاد کے ذہنی پس منظر کے حدود کا تعین اگر ناممکن نہیں، تو دشوار ضرور ہے، لیکن اگر ہم بہت پیچھے کی طرف نہ جائیں، تو سولھویں صدی کے آغاز کو ان کے ذہنی پس منظر کے عہد کا آغاز قرار دے سکتے ہیں کیونکہ یہی زمانہ قدیم و جدید ہندوستانی تاریخ میں حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہیں سے پرانے ہندوستان کی حدیں ختم ہوتی ہیں اور جدید ہندوستان کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں — اس دور کا دو ایسے واقعات سے آغاز ہوا، جو اس وقت کسی خاص اہمیت کے حامل نہ رہے ہوں گے پہلا واقعہ جنوبی ہند میں پیش آیا جہاں ۱۴۹۸ء میں پرتگالیوں کی ایک کشتی واسکوڈی گاما کی سرکردگی میں مالابار کے ساحل پر لنگرانداز ہوئی۔ یہ اہل یورپ کا پہلا قافلہ تھا، جو سمندری راستے سے ہندوستان کی . . . مہماں نواز سرزمین پر اُترا تھا۔ واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرکے مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے باضابطہ روشناس کیا اور ہند و یورپ کے براہ راست تعلقات کی راہیں کھول دیں۔ اس کے ۲۸ سال بعد دوسرا واقعہ شمالی ہند میں پیش آیا جہاں ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیرالدین بابر نے پانی پت کے میدان میں لودیوں کو شکست دے کر ہندوستانی زندگی میں ایک نئے عنصر کو داخل کردیا جو زندگی کی قوتوں سے لبریز اور نئی قدروں کا حامل تھا ان دونوں باتوں میں اس وقت کوئی ندرت نہ رہی ہوگی۔ واسکوڈی گاما کی آمد سے پہلے غیر اقوام کی نہ جانے کتنی کشتیاں ہمارے ساحلوں پر اپنے بادبان لپیٹ چکی تھیں اور بابر کی کامیابی سے پہلے شمالی ہند ہی کے میدانوں نے نہ جانے کتنے نئے آنے والوں کے سروں پر فتح و نصرت کے تاج رکھے تھے بقول ابوالکلام آزاد —

> سرزمین ہند ابتدا سے نوواردوں کی سیر و سیاحت کی جولانگاہ رہی ہے۔ یہاں کے موسموں اور طلائی منڈیوں نے بڑے بڑے کشورستانوں کو اپنی طرف کھینچا ہے اور ہمیشہ اس کے بحری و بری دروازوں پر ملک گیر سیاحوں کی تلواریں چمکتی رہی ہیں۔ تاریخ میں ہم نے مقدونیہ کے سکندر اعظم اور چین کے سیاحوں کو یہاں دیکھا اور پھر اس کے شمالی دروازے سے فتحیاب علموں اور تیروں کی قطاریں صدیوں تک نہیں ٹوٹیں ۱؎

واسکوڈی گاما کی آمد اور بابر کا ورود بھی اسی سلسلے کی آخری کڑیاں تھیں۔ یہ دونوں واقعات جو کم و بیش چوتھائی صدی کے اندر یکے بعد دیگرے پیش آئے تھے۔ بظاہر ان کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن یہ دونوں واقعات ہندوستان کے رہن سہن، علم و ادب، مصوری و موسیقی، صنعت و حرفت، معاشرت، سیاست اور زندگی کے دوسرے تمام شعبوں میں بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ اور آنے والی ساڑھے چار صدیوں کی تاریخ پر پوری توانائی سے اثر انداز ہونے والے تھے۔

۱؎ الہلال ۱ جلد ۱، ۱۲ جولائی ۱۹۱۲ء

لیکن اس کے جانشینوں کو قدرت نے اجداد کے اس ورثے سے بھی محروم رکھا۔ بہادر شاہ اول نے مرہٹوں سے صلح کرلی جن کا اورنگ زیب نے زندگی کے آخری لمحوں تک مقابلہ کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے سارے علاقے پر عملاً مرہٹے حکمراں روائی کرنے لگے۔ دوسری طرف راجپوتوں اور سکھوں نے بھی سر اٹھایا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاکر ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے افغانستان پر قبضہ کرلیا، جو مغل ہندوستان کا ایک صوبہ تھا اور پھر پنجاب کو تاراج کرتا ہوا دہلی تک پہونچ گیا اور واپسی میں تختِ طاؤس کے ساتھ ساتھ آلِ تیمور کی وہ دھاک بھی اپنے ساتھ لے گیا، جو اب بھی لوگوں کے دلوں پر تھوڑی بہت قائم تھی۔ اس حادثے نے اٹھارھویں صدی کی ہندوستانی طوائف الملوکی کو نقطۂ عروج تک پہونچا دیا۔

ادبار اور طوائف الملوکی کے اس دور میں مختلف مذاہب کے احیاء کی جو تحریکیں اٹھیں، ان میں احیائے اسلام کی تحریک کئی اعتبار سے قابل ذکر اور ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق رکھتی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے جید عالم دین اور عظیم مفکر شاہ ولی اللہؒ (۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۳ء — ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) اس تحریک کے روح رواں تھے۔ یہ اگرچہ کوئی نئی چیز نہ تھی اور اس کا سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے اس مذہبی تحریک کو وسعت دے کر وقت کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی تقاضوں کے سانچوں میں ڈھالا اور اس کو نیا رنگ اور نئی آب و تاب بخشی۔

اسلامی ہند کی تاریخ کے شاہی دور میں علماء کا طبقہ سیاسی اعتبار سے عموماً اور مذہبی اعتبار سے خصوصاً دخیل سلطنت رہا تھا اکبر کے عہد میں علماء نے اپنی اس روایتی حیثیت سے، پیر علوم متداولہ سے اکبر کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھاکر اکبر کے الفاظ میں یہ چاہا کہ

"در فرماں روائی و کارگزاری شریک پادشاہی باشند"

لیکن ان علماء کے متعلق اکبر کی رائے یہ تھی:-

"فرمانِ آسمانی و نامۂ جاودانی را، کہ فرستادۂ خدا در رسانندۂ پیغمبر است، بہ رنگ دیگر رامی نامند"

علماء کی اس روش سے اور کچھ اپنی افتادِ طبیعت سے مجبور ہوکر اکبر نے علماء کی تقلید کرنے سے انکار کردیا اور اپنے امام وقت ہونے کا محضر تیار کرایا، جس کے مطابق "بادشاہ خلیفۂ زماں اور امام عہد اور واجب الاطاعت تھا" اور اس کو اس کا حق تھا کہ

"مسائل مختلف فیہا میں حسب ضرورت اجتہاد کرے، اور اس کا اجتہاد واجب العمل تھا"

یہ اقدام دوررس نتائج کا حامل تھا۔ کچھ علماء نے اس محضر پر مہر ثبت کرنے سے انکار کیا۔

اکبر کی عام روش اور امامت کے اس محضر نے علماء کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا۔ جہانگیر کے عہد میں جب مخالف ہواؤں کی رفتار مدھم ہوئی تو مجدد الف ثانی، شیخ احمدؒ سرہندی نے علماء کے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے مؤثر اقدامات کئے۔ انھوں نے بقول ابوالکلام آزاد۔

"لاکھوں دلوں کو اپنی صدائے رعد آسا سے حق کا شیفتہ بنالیا تھا اور احیائے شریعت اور تجدید شعار اسلامی اور اعلانِ حق و امر بالمعروف کے لئے اپنے وجود کو وقف کردیا تھا"[1]

شاہ جہاں کے مذہبی رجحانات نے علماء کی کوششوں کو مزید تقویت بخشی، لیکن شاہجہاں پر وہ اس حد تک غالب نہ آسکے کہ سرے سے اس بساطِ سیاست ہی کو الٹ دیتے جو اکبر نے بچھائی تھی لیکن اورنگ زیب کے عہد میں علماء کو نے حد سازگار حالات ملے اور اسکے مذہبی غلو نے وہ تمام رکاوٹیں دور کردیں جو اکبر نے احیائے مذہب کی راہ میں حائل کردی تھیں۔ شرعی احکام کے نفاذ کیلئے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہوئی اور کار و بارِ سلطنت میں علماء صرف دخیل ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ حکومت کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں آگئی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جب زوال کا دور شروع ہوا، تو اسلامی شریعت بھی اور متعلقاتِ حکومت کی طرح زوال و انحطاط کا شکار ہونے سے نہ بچ سکی۔ شیعہ و سنی علماء کی گروہ بندی جو پہلے سے موجود تھی، اورنگ زیب کے بعد پوری شدت سے ابھری اور علماء کا طبقہ ایرانی و تورانی گروہوں میں بٹ گیا۔ اس تقسیم نے اٹھارویں صدی کی اسلامی زندگی میں بھی پوری شدت سے طوائف الملوکی پیدا کردی۔

یہ حالات تھے جب ۱۷۳۲ء میں شاہ ولی اللہؒ حجاز سے ہندوستان اس انقلابی عزم کے ساتھ واپس آئے کہ "میں آیا ہوں ہر نظام رائج

۱؎ تذکرہ ابوالکلام آزاد۔ صفحہ ۲۲-۲۳ ۲؎ ایضاً ص

شمال و مغرب میں راجپوتوں نے مغرب میں۔ مرہٹوں نے جنوب مغرب میں اور جاٹوں نے دہلی کے قرب و جوار میں سر اُٹھانا شروع کیا۔ لیکن کچھ مغلوں کی دیرینہ ناموری نے، جس کی دھاک دلوں پر بیٹھی تھی اور کچھ اورنگزیب کے سیاسی ہیانہ جوہر نے، ان میں سے کسی کو پوری طور پر ابھرنے نہ دیا۔ لیکن اس صورتِ حال نے اندرونی سورشوں، اور اطمینانو کے جو دروازے کھول دیئے تھے اور اورنگزیب کی ساری عمر انہی کے سدباب میں بسر ہو گئی اور اندرونی حل فشار کی جڑیں اس درجہ مضبوط ہو گئیں کہ اُن کو اُکھاڑ پھینکنے اور حالات کی بکھری ہوئی رگوں کو سنوارنے کے لئے اکبر جیسے مفکر و مدبر کی ضرورت تھی جو برسوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں بھی مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں مغلوں کے عروج و زوال کے دوش بدوش سفید فام فرنگی قسمت آزماؤں کی تجارتی رقابتیں بھی وقت کے پردوں پر متحرک رہیں۔ تاریخ تو ان کی حرکتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی رہی۔ لیکن یہاں کسی نے نہ تو ان کو قابلِ اعتنا سمجھا اور نہ ان کی چالوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سولھویں صدی پرتگالیوں کی صدی تھی۔ اس صدی میں ان کا بیڑہ ہندوستان کے سمندری راستے کی پاسبانی کرتا رہا۔ اس ملک کی تجارتی پیداوار بھی بلا شرکت غیرے اُنھیں کا حصہ رہی۔ ان کی بستیاں قائم ہوئیں اور فروغ پاتی رہیں۔ سولھویں صدی کے آخری دن — ۳۱، دسمبر ۱۶۰۰ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی عالمِ وجود میں آئی۔ سترھویں صدی کے اوائل میں انگریز تاجر ہندوستان وارد ہوئے۔ سورت و مدراس میں اپنی کوٹھیاں بنائیں اور پرتگالیوں کی بحری طاقت کو شکست دیکر اُن کی تجارت کی بھی کمر توڑ دی۔ سترھویں صدی کے وسط میں فرانسیسی تاجروں نے بھی دولت کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لئے ہندوستان کا رُخ کیا اور ۱۶۶۴ء میں فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے انھوں نے بھی ایک تجارتی کمپنی قائم کی اور ہندوستان کے مختلف ساحلی شہروں میں اپنے اڈے بنائے۔ لیکن ان کو وہ عروج نصیب نہ ہو سکا جو انگریزوں کے حصے میں آیا۔ سترھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے انگریزوں نے بمبئی۔ مدراس کے علاوہ کلکتے میں بھی مضبوطی سے قدم جما لئے اور ۱۶۹۹ء میں انھوں نے کلکتے میں ایک مضبوط قلعے کی بنیادیں ڈالیں۔

یہ حالات تھے جب دلی سے سیکڑوں میل دور احمد نگر کے اس تاریخی شہر میں جو ہماری قدیم اور جدید[1] تاریخ کے بہت سے زرّیں ابواب کا عنوان ہے، بوڑھے اور تھکے ہارے اورنگ زیب جس کو مورخوں نے آخری مغل اعظم کہا ہے، جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ اور وصیت کے مطابق دکن کے ایک بلند و پُر فضا مقام پر سپردِ خاک کر دیا گیا اس دور کا ایک مورخ جس کو اورنگ زیب کے ساتھ ہمدردی ہے، حیرت کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ

> کس قدر عجیب اور افسوسناک بات ہے کہ اورنگزیب
> عالمگیر جیسا ہمہ صفت موصوف بادشاہ اکیاون
> سال بکمال دبدبہ و حشمت ہندوستان کے تخت
> پر متمکن رہ کر حکومت کرتا ہے۔ لیکن جب وہ دنیا
> سے رخصت ہوتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ حکومت
> کی عمارت میں گھن لگ چکا ہے اور اب زیادہ دنوں
> تک قائم نہیں رہ سکتی۔"[2]

اورنگزیب نے نوشتۂ حالات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور وقت کی رفتار کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کا وہی نتیجہ ہو سکتا تھا جو ہوا۔ اورنگزیب کے انتقال کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کے ڈھانچہ کا بیٹھ جانا، اکبر کی پالیسی کی صحت مندی کی روشن علامت ہے اورنگ زیب مغلوں کے سیاسی صفات کا یقیناً حامل تھا

بقیہ حاشیہ صد۔ خوش حال خاں افغانوں کو یقین دلا رہا تھا کہ
"سوائے تلوار کے اور کوئی صورت نجات کی نہیں ہو سکتی۔
"جو افغان اسکے سوا اور کچھ سوچتا ہے، وہ گمراہ ہے۔
"افغان تیغ زنی میں مغلوں سے بڑھ کر ہیں۔
"کاش عقل اور سمجھ میں بھی وہ زیادہ محتاط و ہوشیار ہوں
"اگر جدا جدا قبیلے ایک دوسرے کی مدد کریں
"تو بادشاہوں کو بھی ان کے سامنے جھکنا پڑے۔"

[1] ۱۹۴۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور کانگرس کے دوسرے لیڈروں کو احمد نگر کے قلعے میں قید کیا گیا تھا۔

[2] مسلمانوں کا عروج و زوال۔ سعید احمد اکبر آبادی۔ ص ۳۲۱

برطانوی اقتدار کو ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔

ذہنی و فکری اعتبار سے ابوالکلام آزاد بھی شاہ ولی اللہ کی تحریک کی پیداوار تھے اور شاہ ولی اللہ سے ان کو جو گہرا تعلق تھا اس کا اندازہ اُن کے اس والہانہ بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ

"شاہ ولی اللہ کا وجود قدسی فی الحقیقت اپنے اندر الہام ربانی و فیضانِ الٰہی اور فطرت کاملہ و اقتباس انوارِ نبوت کی ایک مستثنیٰ مثال رکھتا تھا۔"[1]

یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ ابوالکلام آزاد کی ابتدائی مذہبی و سیاسی تحریک شاہ ولی اللہ کی تحریک کی آخری کڑی تھی۔

ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی زندگی کا زوال، جو حالات کا قدرتی نتیجہ اور تاریخ کا ایک ناگزیر عمل تھا شاہ ولی اللہ کی زندگی ہی میں پورا ہو چکا تھا اور ان کی وفات (۱۷۶۲ء) سے پانچ سال قبل پلاسی کے قومی سانحے (۱۷۵۷ء) نے اس پر مہر تصدیق بھی ثبت کر دی تھی۔ پلاسی کے میدان میں انگریزوں کو جو کامیابی نصیب ہوئی تھی، اس کے اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں، اس نے تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ جو اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے لے کر انیسویں صدی کے نصف اول تک جاری رہا۔

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کے اسلامی ہند نے دو سید احمد پیدا کئے — سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ء — ۱۸۳۱ء) اور سید احمد دہلوی (۱۸۱۷ء — ۱۸۹۸ء) دونوں کا بڑی حد تک ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق ہے۔ بڑی حد تک دونوں کے مقاصد ایک ہی تھے۔ یعنی مسلمانوں کی اصلاح و ترقی اور ان کے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی۔ مگر حصولِ مقصد کے لئے دونوں نے متضاد راہیں اختیار کیں۔ غالباً یہ کرشمہ تھا مکان و زماں کے بُعد کا۔ دونوں نے اپنے اپنے زمانے میں اصلاحی و سیاسی تحریکیں چلائیں اور تاریخ میں اپنے واضح نشان چھوڑے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سوجھ بوجھ، لیاقت و قابلیت اور قیادت کی اہلیت دونوں میں بدرجہ اتم موجود تھی لیکن حصول مقصد کے سلسلے میں ایک شہید اور دوسرے سر ہوئے

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

سید احمد بریلویؒ شاہ ولی اللہؒ کے خلیفہ شاہ ابوسعید بریلوی کے حقیقی نواسے، اور اپنے زمانے میں ان کی تحریک کے سب سے بڑے علَم بردار تھے۔ یہاں پر ان کی تحریکِ جہاد کی تفصیل میں ہم نہ جائیں گے لیکن ان کی تحریک کے سیاسی پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے اور وہ یہ تھا کہ

"ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور انھوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی۔ کسی کو ان کے مقابلے کی تاب نہیں، بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے چونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر بیٹھے ہیں، اس لئے چند کمزور اور بے حقیقت افراد نے اس کا (ان کو ملک سے نکال باہر کرنے کا) بیڑہ اٹھایا ہے۔"[2]

ایک دوسرے خط میں انھوں نے راجہ ہندو راؤ کو اور زیادہ واضح الفاظ میں لکھا کہ

"یہ ودیسی سمندر پار والوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے"[3]

سید احمد بریلوی کی شہادت سے تقریباً تیرہ سال پہلے سید احمد دہلوی ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی رگوں میں وہ مجاہدانہ خون نہ تھا جو ان کے بریلوی ہم نام کے حصے میں آیا تھا۔ ان کے دادا کو اکبر ثانی نے "جواد الدولہ" کا خطاب دیا تھا جو حسنِ اتفاق سے خود سید صاحب (سید احمد دہلوی) کو بھی عنایت ہوا۔[4]

ان کے نانا "دبیر الدولہ، امین الملک خواجہ فرید الدین خاں بہادر مصلح جنگ" کو اگر ایک طرف اکبر ثانی نے دو بار مسندِ وزارت پر مامور کیا تو دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ حکومت کا اعتماد بھی ان کو حاصل تھا۔ چنانچہ "لکھنؤ کے یورپین عہدہ داروں کی سفارش سے"

---

[1] الہلال جلد ۲۔ نمبر ۲ ۱ جنوری ۱۹۱۳ء ص ۲۳

[2] علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر مقالہ خلیق احمد نظامی "سید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی" ص ۱۶، (فٹ نوٹ)

[3] ایضاً

[4] تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ۔ حصہ نثر۔ ص ۳۸

کو توڑ پھوڑ دینے کے لیے[۵] ہندوستان کے حالات کی ابتری کے پیشِ نظر ان کے اہلِ وطن معتقدین نے ان کو واپس نہ آنے اور حجاز میں سکونت اختیار کر لینے کا مشورہ دیا تھا لیکن ان کو اپنے وطن سے بے پایاں محبت تھی جس کا اندازہ ان کی ایک غزل کے اشعار سے ہوتا ہے جو انھوں نے غالباً حجاز سے روانہ ہوتے وقت کہی تھی۔

تا نہ کے محنت ہجوری و دوری بکشتم

یاریں وطنم سوئے وطن یار روم

تا نہ کے ہمدمئ سگ بود دستورِ من

گوہرے از عدنم سوئے عدن بار روم

تا نہ کے بستۂ زنجیرِ تعلق باشم

آہوئے ارضِ حرم، سوئے حرم بار روم

شاہ صاحب کے مندرجہ بالا اشعار میں جس والہانہ انداز سے وطن کا ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں وطن اور وطن پرستی کا اگر واضح نہیں تو مبہم تخیل ضرور موجود تھا، جو ہندوستان کے سیاسی شعور کے ارتقاء کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی اور بھی کئی خصوصیتیں قابلِ تذکرہ ہیں، وہ پہلے مسلمان تھے جس نے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا جو اس وقت ہندوستان کی مروجہ علمی زبان تھی۔ اس وقت تک دنیا کی کسی زبان میں بھی قرآن کا ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ شاہ صاحب کے اس اقدام نے قرآن کے علم کو، جو اس وقت تک صرف علماء و فقہاء تک محدود تھا، وسعت دے کر متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں تک پہونچا دیا اور ان کو علماء کی محتاجی سے نجات دلائی۔ اس نے علماء کی مذہبی اجارہ داری کو شدید نقصان پہونچایا۔ شاہ صاحب کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تقلید پر اجتہاد کو صرف ترجیح ہی نہیں دی، بلکہ اس کو ضروری قرار دیا۔ علمائے وقت جو صرف تقلید کے عادی تھے اور دوسروں سے بھی وہ اسی کا مطالبہ کرتے تھے، ان کے مقابلے میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ

"اجتہاد در عصرِ فرض ما لکفایہ است"

ان سب سے بڑھ کر شاہ صاحب کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی، مذہبی اور سماجی زندگی کی کمزوری کو بڑی بے باکی و بے لاگی سے بے نقاب کیا۔ سیاسی زوال کے اسباب کا جو انھوں نے تجزیہ کیا تھا وہ حیرت ناک حد تک سائنٹیفک اور واضح تھا، ان کے نزدیک محنت و سرمایہ کی غیر مساوی تقسیم زندگی کے توازن کو درہم برہم کر رہی تھی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ

"اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمراں جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنالے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقے پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدائے تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ قدرتِ الٰہی انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے اس ناجائز بوجھ کو اتار دے"[۶]

ہندوستانی معاشرہ بلا تفریقِ مذہب و ملت، اسی زبوں حالی کے دور سے گزر رہا تھا۔ جس کا مندرجہ بالا اقتباس میں ذکر کیا گیا ہے۔

ملک کا سیاسی مطلع طوائف الملوکی کے دور کے گرد و غبار سے جوں جوں پاک ہوتا گیا، شاہ صاحب کی تحریک کے خد و خال بھی اسی کے ساتھ ساتھ واضح ہوتے گئے اور اس کا حلقۂ اثر بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ شاہ صاحب نے اور ان کی تحریک نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی زندگی پر جو واضح نقوش چھوڑے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں مسلمانوں کی جتنی بھی انگریز دشمن تحریکیں اٹھیں وہ براہِ راست شاہ ولی اللہ کی تعلیمات ہی کی پیداوار تھیں۔ اور اس تمام عرصہ میں ہندوستان کی شمالی و مغربی کوہستانی سرحدوں سے لے کر جنوبی ہند کے مُرغ زاروں تک ان کی تحریک نے کسی نہ کسی شکل میں

---

[۵] سعید احمد اکبر آبادی - تذکرہ - ص

[۶] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک - عبید اللہ سندھی ص ۶۲

جس بے باکی اور بے لاگی سے اسباب بغاوت کا تجزیہ کیا تھا، وہ اُن کے کردار کا ایک ایسا روشن پہلو ہے، جس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسباب بغاوت ہند کا بنیادی خیال یہ تھا کہ بغاوت کے ذمہ دار ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام تھے، جنھوں نے "کوشش کی ہشل نابود کر دیے علم عربی و سنسکرت کو اور محتاج کر دیے ملک کے۔" بقول مولوی طفیل احمد سرسید کی یہ کتاب "کمپنی کی صد سالہ حکومت کی ایک صحیح و مکمل تصویر اور سیاست پر ایک ہندوستانی کا سب سے پہلا رسالہ ہے، جو توپ کے منہ کے سامنے ایک ملازم سرکار نے لکھا"[1]

سرسید نے اس کے پانچ سو نسخے چھپوائے تھے اور سب کے سب انھوں نے تقسیم ہونے کے لئے انگلستان بھیج دیے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت خالص "ہندوستانی" تھی، جس میں ہندو اور مسلمانوں نے بلاتفریق مذہب حصہ لیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں مسلمانوں کی حیثیت محرک عامل کی تھی، اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں نے خصوصاً اپنے انتقام کا نشانہ بنایا، بلکہ ہر مسلمان کو قابل گردن زدنی سمجھا جانے لگا۔ حکومت کی اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے سرسید نے "وفادار مسلمانان ہند" کے عنوان سے پائنیر (۱۸۶۰ء – ۱۸۶۱ء) میں مضامین لکھنے شروع کئے۔

مسلمانوں کو حکومت کے ساتھ تعاون کرنے پر مسلمانوں کو آمادہ کرنے کی ان کے نزدیک صرف یہی ایک صورت تھی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم اور زمانے کے نئے تقاضوں سے آشنا کیا جائے۔ سرسید صرف مسلمانوں ہی کے لئے اس کو ضروری نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کی تشخیص کے مطابق تمام ہندوستانیوں کے مرض کا بھی یہی واحد علاج تھا، چنانچہ ملازمت کے سلسلے میں جہاں بھی ان کا تبادلہ ہوا انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے لئے بلاتفریق مذہب، اسکول کھولنے کی کامیاب کوششیں کیں، غازی پور میں انھوں نے اسکول کے ساتھ ساتھ ایک علمی انجمن بھی "سائنٹفک سوسائٹی" کے نام سے بنائی۔ سرسید کے دوست مسٹر گراہم کی وساطت سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ اس سوسائٹی کا افتتاح (۱۸۶۴ء) کرتے ہوئے سرسید نے اپنی تقریر میں جدید علوم کے فوائد گناتے ہوئے، یہ بھی بتلایا تھا کہ "تاریخ ہم کو اس لئے پڑھنی چاہیے کہ بغاوت کی غلطی کا ہم دوبارہ اعادہ نہ کریں"[2]

غازی پور سے سرسید کے تبادلے کے ساتھ ساتھ یہ سوسائٹی بھی علیگڑھ منتقل ہو گئی، جہاں "اس کا سنگ بنیاد صوبے کے لفٹنٹ گورنر کے ہاتھ سے ۱۸۶۶ء میں رکھا گیا۔ اس سوسائٹی میں انگریزی کتابوں سے اُردو میں ترجمے ہوتے تھے اور علوم جدیدہ پر لکچر دیئے جاتے تھے۔ اخبار "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" بھی اسی سال اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں نکالا گیا۔"[3]

۱۸۶۹ء میں سرسید نے انگلستان کا سفر کیا۔ اسی تاریخ سے ان کی زندگی کا دوسرا دور، جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد شروع ہوا تھا، ختم ہوا، اور تیسرا دور شروع ہوا جو ان کی زندگی کا اہم ترین دور تھا، انگلستان میں سرسید نے بقول جواہر لال نہرو۔

"یورپین تمدن کو پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر دیکھا اور وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ بچوں کی طرح ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ پہلے تو صرف سیاسی اعتبار سے وہ انگریزوں سے وابستگی پیدا کرنے کے پُر زور مبلغ تھے اب تمدنی اعتبار سے بھی انگریزوں سے گہری دلچسپی ہو گئی اور انھوں نے یہ اپنا فرض سمجھا کہ اپنے ہم مذہبوں کو اس پر آمادہ کریں کہ انگریزی راج ہی کو نہیں، بلکہ مغربی تمدن کو بھی وہ قبول کر لیں۔"[4]

اسی سفر میں خود سرسید کے الفاظ میں

"حضور ملکہ معظمہ نے مجھکو کمپینین آف دی اسٹار آف انڈیا" سے معزز و ممتاز فرمایا۔ اور تمغہ اسٹار آف انڈیا مرحمت ہوگا اب میں احباب کی دُعا سے سید احمد خان بہادر سی، آئی، ای ہو گیا اس موقع پر تمام معزز انگریز دوستوں نے مبارکباد دی اس درجہ کی دی

---

[1] مولوی طفیل احمد مسلمانوں کا روشن مستقبل (۱۹۴۵ء دہلی) ص ۱۹۵

[2] Graham Life and works of Sir Syed Ahmad Khan, pp 52-54 - A

[3] مولوی طفیل احمد تذکرہ۔ ص ۱۹۸

[4] جواہر لال Discovery of India ص ۲۹۸

بقول مولانا حالی شیخ فریدالدین کو کلکتہ مدرسہ کی سپرنٹنڈنٹی کا عہدہ بمشاہرہ سات سو روپیہ ماہوار ملا۔ مولانا حالی ہی کی وساطت سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ بھی ہوتا ہے کہ ویلزلی نے ان کو ایک خاص مقصد کے لئے انگریز سفیر بنا کر ایران بھیجا، پھر برہما میں بھی ایک پولیٹیکل معاملہ طے کرنے کے لئے خواجہ فرید کو انگریزی ایجنٹ مقرر کرکے بھیجا گیا۔[1]

سید احمد دہلوی نے، جو ہماری تاریخ میں سرسید کے نام سے مشہور ہوئے، "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی" شمع کی میلی چھاؤں میں آنکھیں کھولیں۔ اس وقت ہندوستان کے آسمان پر تاروں کی جھلملاہٹ ماند پڑ چکی تھی اور صبح کاذب کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ ان کے والد کو "اکبر ثانی کے زمانہ میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر تین پارچہ اور پانچ رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا، مگر اخیر عمر میں انھوں نے دربار میں جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجودے کہ ان کی عمر کچھ بھی دلوانا شروع کر دیا تھا۔" اور اس سے آنکھیں کھولتے ہی سرسید کا بھی تعلق اس "معلی دربار" سے قائم ہو گیا تھا، جس کی جھوٹی آن و تان بھی اب صرف چند دور کی مہمان تھی۔

سرسید نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ دلی کے صدر امین کی عدالت میں پہلے پہل (۱۸۳۸ء) سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔ سال بھر بعد ترقی کی اور نائب منشی ہو کر آگرے چلے گئے۔ ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کیا ۱۸۵۶ء میں ترقی کر کے صدر امین ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہوئی تو بجنور میں وہ متعین تھے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ساتھ ہی ان کی زندگی کا پہلا دور ختم ہوا۔ اس دور میں ملازمت کے علاوہ انھوں نے کم از کم چودہ چھوٹی بڑی، مذہبی و تاریخی کتابیں لکھیں۔ ان میں آثار الصنادید سب سے زیادہ قابل ذکر ہے جس نے ان کی شہرت کو پر لگا دیئے۔ ان کے اس دور کے سیاسی رجحانات کا ہم کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد سے ان کو غالباً ہمدردی تھی۔ آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں جس جگہ انھوں نے سید احمد بریلوی کا ذکر کیا ہے وہاں ان کا قلم، بقول خلیق احمد نظامی "وجد کرنے لگا"۔ لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے

[1] حالی متذکرہ - ص ۲۱ - ایضاً ص ۳۵

کہ آثار الصنادید کا جب دوسرا ایڈیشن (۱۸۵۴ء) شائع ہوا، تو اس میں وہ باب پورا غائب تھا جس میں مولانا سید احمد شہید اور ان کے رفقا کا حال درج تھا۔ یہ کوئی اتفاقی یا غیر ارادی بات نہیں تھی۔ بلکہ ہندوستان کی سیاسی فضا کی تبدیلی کا اثر تھا۔[1]

یہ واقعہ جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے کا ہے، سرسید کی موقع شناسی کی ایک اچھی مثال ہے۔

علی گڑھ تحریک کا پس منظر

بغاوت جس میں سرسید کی ہمدردیاں فریق مخالف کے ساتھ تھیں کی ناکامی کے نتائج نے سرسید کے دل و دماغ کو بے حد متاثر کیا، اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ فکر و عمل کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جو اب تک بے حسی و بے عملی کی چٹان تلے دبا تھا، ایک بارگی کوہ آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلا، اور اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔

بغاوت کی ناکامی کے بعد دلی کی ہولناک بربادی اور شمالی ہند کے مسلمانوں کی عبرت ناک تباہی کو دیکھ کر پہلے تو وہ اوسان کھو بیٹھے اور ہجرت کر جانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ سرسید نے بغاوت کا رونا رونے کے بجائے مرد حقیقت بین کی طرح ماضی سے دامن جھاڑ کر اور حال سے بے پرواہ ہو کر اگلی منزل کا سامان سفر درست کرنے کی فکر شروع کی۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا قدم یہ تھا کہ انگریزوں کی نفرت جو مسلمانوں کے دلوں میں رچ بس گئی ہے، نکال پھینکی جائے اور ان کو برضا و رغبت حکومت کے ساتھ تعاون پر آمادہ کیا جائے۔ دوسری طرف حکومت کے سر سے مسلمانوں کو کچل ڈالنے کا سودا دور کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم اُن کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" تھی۔ کتاب کا نام قابل لحاظ ہے۔ انگریزی حکومت اور انگریزی[2] اخبارات اس جہاد آزادی کو غدر کا مہمل نام دے کر اس کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے تھے، ایسے وقت میں اس تحریک کے لئے غدر کے بجائے "بغاوت" کا لفظ استعمال کرنا بجائے خود بڑی ہمت کا کام تھا، خصوصاً ایک ایسے شخص کے لئے جو سرکاری ملازم بھی ہو، سرسید نے

[1] خلیق احمد نظامی متذکرہ ص ۱۱۶

[2] Smith Modern Islam in India p 8

انگریز ہوں"[51]

سرسید کے باب میں محسن الملک سے زیادہ معتبر کوئی اور راوی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ہم کو بتلایا ہے کہ سرسید مسلمانوں کا "ایک ایسا فرقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو

"از روئے مذہب مسلمان ہو اور از روئے خون و رنگ کے ہندوستانی ہو، مگر بہ اعتبار مذاق، رائے، اور فہم کے انگریز ہو۔"[52]

نے کا کے نے جو بات گورنر جنرل کی کونسل میں کہی تھی، محسن الملک نے بعینہٖ بلفظہٖ وہی بات لاہور کے عام جلسے میں دہرائی۔ اسی نظریے کے تحت کالج کو آکسفورڈ اور کیمبرج کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ذریعہ تعلیم بھی انگریزی زبان تھی اور نصاب تعلیم بھی خالص مغربی تھا، جس میں بقول کینٹ ول اسمتھ۔

"اسلامی دینی تعلیم کا اضافہ ضرور کیا گیا تھا، پرنسپل اور اُستاد بھی انگریز ہی تھے، بالفاظ دیگر عیسائی مشنری کالجوں اور اس کالج میں مابہ الامتیاز صرف اسلامی دینیات کی تعلیم تھی جس نے عیسائی دینیات کی جگہ لی تھی۔"[53]

سرسید یقیناً برطانیہ پرست تھے اور تاج برطانیہ کی وفاداری بھی ان کے ایمان کا لاینفک جزو تھی، لیکن اس کے متعدد اسباب تھے اور ان میں سے کچھ اپنے اندر وزن بھی رکھتے تھے۔ اس کی پہلی اور بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کو اس کا یقین ہو گیا تھا کہ بغاوت کی ناکامی نے انگریزی حکومت کے قدم مضبوطی سے اس ملک میں گاڑ دیے ہیں، جو مستقبل قریب میں اُکھاڑے نہیں جا سکتے، پھر یہ کہ موجودہ حالات میں گورنمنٹ کی مخالفت سے ہم کو فائدے کی بجائے نقصان ہوگا۔ پھر گزشتہ ڈیڑھ دو سو برس کی ہندوستانی تاریخ، جو طوائف الملوکی کی تاریخ تھی، اس کے مقابلے میں بقول مولانا حالی۔

"قانونی گورنمنٹ کا قائم ہونا اور ہر طرف امن و امان ہونا انھیں غنیمت معلوم ہوا، اس لئے وہ اس سلطنت کو ملک و قوم کے لئے بے حد مفید سمجھنے لگے۔"[55]

سرسید کی برطانیہ پرستی آج ہم کو کتنی بھی گراں گزرے، لیکن حقیقت ہے کہ ان حالات میں یقیناً ناگزیر تھی، اس دور میں کوئی بھی ایسی قابلِ ذکر شخصیت نظر نہیں آتی، جس کی ذات اس سے بری رہی ہو۔ بنگال کے انتہا پسند لیڈر بھی اپنے مطالبات پیش کرنے سے پہلے تاج برطانیہ کی وفاداری کی قسمیں کھاتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے سرسید جتنے برطانیہ پرست تھے اس سے کہیں زیادہ بچے ہندوستانی بھی تھے، اور یہ ان کی زندگی کا بڑا ہی تابناک پہلو ہے، جس کو نظرانداز کرنا ناانصافی ہوگی۔ اس کی حمایت میں سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے اَن گنت اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں صرف دو اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس کا نام "سائنٹفک سوسائٹی اخبار" تھا۔ ۱۸۷۰ء میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اینڈ پروگریس" ہو گیا۔

۱۸۷۱ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی نے یہ طے کیا کہ آئندہ سے "ہندوستانیوں کی تنخواہ بہت کم کر دینی چاہیئے اور نہایت درجہ کسی ہندوستانی کی تنخواہ پچھتر روپے سے زیادہ نہ کی جائے۔" اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انسٹیٹیوٹ گزٹ نے لکھا۔

"ہم افسوس کرتے ہیں کہ جب کبھی کمی کی نوبت آتی ہے تو سب سے پہلے ہندوستانی اس کے مستحق ہوتے ہیں، اور اگر بیشی کا وقت آتا ہے تو ایک مدت تک ان بے چاروں کی لیاقت ہی کی تحقیقات ہوتی ہے۔ اس کے بعد کسی نہ کسی وجہ سے وہ غیر مستحق ٹھہرتے ہیں اس تنخواہ کے محدود کرنے کا سبب ظاہراً ہماری نظر میں نہیں ہے، اگر ہے، تو ہندوستانیوں کی کم نصیبی ہے، جو بلا وجہ بھی یہ بے چارے ایسی حق تلفی کے مستحق ہو جاتے ہیں، کاش اگر ایسے امور میں سے ہندوستانیوں کے نام کی تخصیص جاتی رہتی تو بہت مناسب تھا، مگر یہ تو بہت مشکل ہے۔"[54]

۱۸۷۲ء کے اوائل میں مرادآباد میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ اس سے پہلے اسی سال میں اسی طرح کا فساد بریلی میں ہو چکا تھا، اس موقع پر انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے طول طویل اڈیٹوریل لکھا، اس کا آخری ٹکڑا

---

[51]

[52] حالی متذکرہ

[53] " " محسن الملک مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۳۰۶

[54] سائنٹفک سوسائٹی اخبار۔ دسمبر ۱۸۷۱ بحوالہ اکمل الاخبار (دہلی) ۳ جنوری ۱۸۷۲ء

ہے اور ایسا مفر رحاصل کیا ہے کہ یہاں سے (لندن سے)
ناہر لارڈ لارنس نے گورنر جنرل بہادر نے میرے لئے صلہ
مقرر کیا اور بڑے بڑے رؤسا اور مدبروں کو ملایا۔"[1]

انگلستان کے دوران قیام میں سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں ان کی جو غیر معمولی آؤ بھگت ہوئی، اس کی ایک جھلک ہم نے دیکھی ہے اور سرسید کے دل و دماغ نے اس کا جو اثر قبول کیا تھا اس کی جھلک بھی اسی میں ہم کو نظر آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و تعلیمی زندگی کا سرسید کے ذہن میں جو خاکہ تھا، اس نے بھی انگلستان کے دوران قیام میں واضح شکل اختیار کر لی۔ انگلستان سے واپسی کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، جو نقل تھی ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر کی۔ جنھوں نے اٹھارویں صدی کے اوائل میں انگلستان کی اخلاقی و مجلسی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا تھا "تہذیب الاخلاق" نے بھی بقول سر عبدالقادر۔

"مسلمانوں کے سماجی مذہبی اور علمی حلقوں میں ہل چل مچا دی۔ اگرچہ ۱۸۷۶ء میں اس کی زندگی ختم ہو گئی، لیکن ساتھ ہی اسلامی سوسائٹی اور اردو ادب پر اس نے اپنے دائمی نشانات چھوڑے۔ سرسید احمد خاں نے اس رسالے میں جو مضامین لکھے، ان کی دائمی حیثیت ہے۔"[2]

تہذیب الاخلاق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو رجعت پرستی کے گہرے غار سے نکال کر کھلی ہوا میں لا کھڑا کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پرست مذہبی طبقہ، جو رجعت پرستی کا علمبردار تھا، ہاتھ دھو کر سرسید کے پیچھے پڑ گیا۔ بات بڑھتے بڑھتے تکفیر کی حد تک پہونچی اور مخالفین نے "تہذیب الاخلاق" کا نام "تخریب الاخلاق" رکھ دیا۔ اسی سلسلے میں سرسید کی تعلیمی اسکیم بھی مخالفت کا نشانہ بنی۔

سرسید دھن کے پکے، مضبوط دل و دماغ اور مستحکم ارادوں کے آدمی تھے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگوں کی مخالفت کے باوجود
"۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جو ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا[3] مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہی اسکول بعد میں کالج، پھر یونیورسٹی بنا اور تمام دنیا میں مشہور ہوا۔"[4]
اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔

"عام مسلمان سرسید کی مذہبی تحریک سے ناراضی کی وجہ سے چندہ میں شریک نہ ہوئے، البتہ حکام وقت کی مدد سے چندہ ملنا شروع ہوا۔ سب سے اول سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر صوبۂ متحدہ نے خود ایک ہزار روپیہ اپنی جیب سے دیا، اور ان کی توجہ سے ہز ہائی نس نواب کلب علی خاں والی رام پور اور دیگر رؤسائے عظام نے چندہ میں شرکت کی، اور لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے ۱۸۷۲ء میں یعنی کالج قائم ہونے سے تین سال قبل اپنی جیب خاص سے دس ہزار روپے دیئے تھے۔"[5]

یہی ادارہ سرسید کے خواب کی تعبیر اور ان کی آرزوؤں و تمناؤں کا مرکز تھا۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں سرکاری ملازمت سے پنشن لینے کے بعد پیر توڑ کر علی گڑھ میں بیٹھ گئے۔ سرسید کی نیک نیتی، دردمندی اور ان کے خلوص سے مشکل ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے اور اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ نو زائیدہ درسگاہ خود سرسید کے خواب سے زیادہ میکالے کے اس خواب کی تعبیر تھی، جو اس درس گاہ کے وجود میں آنے سے نصف صدی قبل ۱۸۳۳ء میں میکالے نے دیکھا تھا۔ گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستانیوں کو انگریزی کی تعلیم دینے کی حمایت کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ ہندوستانیوں کا میں ایک ایسا گروہ پیدا کرنا چاہتا ہوں جو

"رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں، لیکن فکر و مذاق اور دل و دماغ کے اعتبار سے

---

۱ خطوط سرسید مرتبہ راس مسعود - ص ۲۶
۲ سر عبدالقادر Famous Urdu poets & writers ص ۸۲

۳ دیکھئے میو میموریل گزٹ - دہلی - ۱۸۷۲ء
۴ مولوی طفیل احمد - تذکرہ ص ۲۱۶
۵ " " ص ۲۱۵

میر ولایت حسین جو بنگ کے شاگرد تھے، ان کی وساطت سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی مسٹر بنگ نے انسٹیٹیوٹ گزٹ پر قبضہ کر لیا۔

"آخر عمر تک سرسید علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر رہے
مگر پچھلے دنوں بوجہ پیرانہ سالی اور کالج کے کاموں میں
مصروفیت کے انسٹیٹیوٹ میں بہت کم مضامین لکھا کرتے
تھے، اس لئے انسٹیٹیوٹ گزٹ کی حالت اچھی نہ تھی۔
بابو سریندر ناتھ بنرجی کی تقریر انسٹیٹیوٹ ہال میں
سننے کے بعد وہ پولیٹیکل دنگل میں اترنا چاہتے تھے اور
بنگالیوں کے بڑھتے اثر کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔
انھوں نے سرسید سے کہا کہ آپ کو انسٹیٹیوٹ گزٹ کی
طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ آپ اس کو میرے
سپرد کر دیجئے۔ میں اس کی حالت درست کر دوں گا۔
سرسید نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ اور مسٹر بنگ
نے بنگالیوں اور ان کی تحریک کے خلاف انسٹیٹیوٹ گزٹ
کے ایڈیٹوریل کالم میں مضامین لکھنے شروع کئے جو سرسید
سے منسوب ہوئے اور بنگالیوں نے سرسید کو برا بھلا
کہنا شروع کیا اور اس طرح بنگالیوں سے علانیہ
لڑائی شروع ہو گئی[41]"

میر ولایت حسین مرحوم کا یہ بیان لفظ بلفظ صحیح ہے لیکن سرسید جیسے جہاندیدہ اور تجربہ کار پیر مرد کا ایک نوعمر انگریز کے ہاتھ میں اس طرح بے ارادہ کھیلنا سمجھ میں نہیں آتا مسٹر بنگ جن کی رائے بنگ کے متعلق نقل کی جا چکی ہے۔ سرسید سے پہلی ملاقات کے بعد سرسید کے متعلق ان کی رائے تھی کہ

"ان سے مل کر ایک حد تک مجھے مایوسی ہوئی۔ یقیناً
وہ شاندار پیر مرد ہیں، مگر مجھے ان پر پورا بھروسہ نہیں
ہو سکا ہے ۔ مجھے تعجب نہ ہوگا اگر وہ ایسے اچھے
ثابت نہ ہوں، جیسے بظاہر معلوم ہوتے ہیں[42]"

اس میں شک نہیں کہ دوسری ملاقات کے بعد بلنٹ نے ان کے متعلق اپنی رائے میں ترمیم کی تھی، لیکن محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پہلی رائے زیادہ صحیح تھی۔ بہرحال علی گڑھ کے انسٹیٹیوٹ ہال میں سریندر ناتھ کی تقریر کے بعد ہی سرسید کی تعلیمی تحریک نے جارحانہ سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ سرسید کے ہاتھوں سے علی گڑھ کی قیادت نکل جانے کے بعد یہ سرسید تحریک نہیں رہی بلکہ علی گڑھ تحریک بن گئی اور "طوطی صفت" سرسید حقیقی معنوں میں "پس آئینہ" بیٹھ گئے اور انکی بھی یہ رائے ہو گئی کہ۔

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث
کرنے سے ہماری ترقی ہوگی، اس سے میں اتفاق
نہیں کرتا، بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم کی
ترقی کو ذریعۂ قومی ترقی سمجھتا ہوں[43]"

بقول مولوی طفیل احمد مرحوم۔

"سرسید کی ضعیفی کے زمانے میں علی گڑھ کالج پر بہ
تبدیلِ الفاظ یہ مثل صادق آتی ہے
قوم خدا کی، کالج سرسید کا، حکم بنگ بہادر کا[44]"

بنگ کے بعد علی گڑھ تحریک کی قیادت اُن کے دوسرے انگریز جانشینوں میں منتقل ہوتی رہی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگرس قائم ہوئی اس کے بنانے میں بھی علی گڑھ تحریک کا مدرسہ بالا سے زیادہ بختگی سے ہمارے سامنے آیا مسلمانوں نے بھی، جن کی تعداد زیادہ تھی کانگرس میں شرکت کی، لیکن من حیث الجماعت مسلمان کانگرس سے الگ تھلگ اور علی گڑھ تحریک کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے گئے۔

۱۹۰۵ء میں حکومت نے بنگال کے صوبے کو ہندو و مسلم حصوں میں بانٹ دیا، جس کا واحد مقصد بنگالیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کرنا تھا۔ اسٹیٹس مین نے، جو حکومت کا ترجمان تھا اس کی وجہ واضح الفاظ میں یہ بتلائی تھی کہ

"مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو آگے بڑھانے سے
ہمارا مقصد یہ ہے کہ ملک میں ہندو تعلیم یافتہ طبقہ
کی بڑھتی ہوئی قوت کا ہم بہ آسانی سدباب کر سکیں[45]"

---

[41] مولوی طفیل احمد مذکرہ ص ۲۸۰

[42] Blunt op.cit p.156

[45] مولوی طفیل احمد مذکرہ ص ۲۸۲

نقل کیا جاتا ہے ۔

"کاش ہندوستان کے لوگ اگر عقل رکھتے ہوتے اور جوش حالت ان غالب ہوتا تو بجائے اس نفاق کے ان کے دلوں میں عام ہمدردی اور محبت ہوتی اور جو خراب نتیجہ اب ان کو اس نفاق کا ملتا ہے، بجائے اس کے ان کو اتفاق کا نتیجہ ملتا، جس کے سبب آبرو، جان و مال محفوظ و مامور ہوتا اور ایک غیر قوم کی گورنمنٹ کے نزدیک بھی اس کا وقار ہوتا اور اس کے باہمی اتفاق کے مستحکم اثر طرح طرح کے مراد ان کے لیے شگفتہ کرتا[1]"

۱۸۸۳ء میں مسٹر بک کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر علی گڑھ وارد ہوئے انھوں نے محنت و خوش اخلاقی سے طلبا کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور بانیٔ کالج کو بھی اپنی مٹھی میں لے لیا۔ وہ مخصوص سیاسی نظریات کے حامل تھے "یہ کہنا مشکل ہے کہ بک صاحب ہندوستان کے متعلق ایسے پولٹیکل عقائد انگلستان ہی سے مستحکم کرکے یہاں بھیجے تھے یا یہ کہ اسی ملک میں آکر اور یہاں کی انگریزی سوسائٹی میں مل جل کر انھوں نے اپنا خاص نظریہ قائم کیا۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہاں آنے سے پہلے وہ اپنی راہ متعین کر چکے تھے کیونکہ ہندوستان کی انگریزی سوسائٹی میں بک صاحب کی شرکت بہت تھوڑی تھی یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ ان کے پولیٹیکل عقائد انگلستان ہی سے قائم ہو چکے تھے اور یہاں پہونچ کر اس پر انھوں نے بتدریج عمل کیا[2]" یہ رائے مسٹر بک کے ایک شاگرد کی ہے۔

مسٹر بک کے علی گڑھ پہنچنے کے چند ہی مہینوں کے بعد مسٹر بلنٹ (Blunt) ہندوستان آئے ۔ ان سے ملنے کے بعد بلنٹ نے اپنے روزنامچے میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مسٹر بک

"یقیناً عام انگریزوں سے مختلف ہیں اور ایک عام انگریز یہاں کامیاب بھی نہیں ہو سکتا۔ غالباً وہ بہت عیار ہیں[3]"

مسٹر بک کے بعض شاگردوں کی رائے بھی ان کے متعلق ایسی ہی تھی۔ مولوی طفیل احمد کی وساطت سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ

"بعض لوگ مسٹر بک کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ خان بہادر مولوی بشیرالدین (اٹاوہ) اُسی زمانے میں مسٹر بک کی نسبت کہا کرتے تھے کہ یہ اُسی قسم کے لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اول ہندوستان میں آکر انگریزی سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی[4]"

مسٹر بک ہندوستان ایسے وقت میں آئے تھے یا بھیجے گئے تھے جبکہ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں عموماً اور بنگالیوں میں خصوصاً سیاسی بے اطمینانی کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا، مسٹر سریندر ناتھ بنرجی کی سرکردگی میں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کلکتے میں قائم ہو چکی تھی جو انڈین سول سروس کے امتحانات کے سلسلے میں سختی سے یہ مطالبہ کر رہی تھی کہ سول سروس کے امتحان ہندوستان میں ہوا کریں، اور عمر کی جو قید رکھی گئی ہے، وہ بڑھا دی جائے۔ سرسید اس تجویز کے حق میں تھے۔ سرسید کی دعوت پر سریندر ناتھ بنرجی علی گڑھ آئے اور سرسید کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ اور بقول محسن الملک

"اس روز کا جلسہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اور وہ کئی طرح قابل یادگار ہے۔ اس کے بعد میں نے ایسا جلسہ نہیں دیکھا جس میں سیاسی و نیم سیاسی امور کے لحاظ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے دلوں میں ایک ہی قسم کے خیالات ہوں[5]"

اس جلسے میں مسٹر بک واحد یورپین تھے، ان کی طرف اشارہ کرکے مسٹر سریندر ناتھ بنرجی نے کہا،

"ہم لوگ محصولات (ٹیکس) ادا کرتے ہیں یہ لوگ (مسٹر بک کی طرف اشارہ کرکے) جس طرح ان کا جی چاہتا ہے، اُن محصولات کو خرچ کرتے ہیں اور حظ اُٹھاتے ہیں[6]"

---

[1] سائنٹیفک سوسائٹی اخبار۔ دسمبر ۱۸۷۰ء بحوالہ اکمل الاخبار (دہلی) ۳ جنوری ۱۸۷۲ء

[2] حبیب اللہ خاں۔ علی گڑھ میگزین (علی گڑھ نمبر) بحوالہ تھیوڈر بک، ص ۱۵۷

[3] W C Blunt. India Under Ripon p 156

[4] مولوی طفیل احمد۔ تذکرہ۔ ص ۲۷۶

[5] " " " ص ۲۷۷

[6] " " " ص ۲۷۸

محمد مہدی

"الہلال" اور بین الاقوامی سیاست

جن لوگوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ اخبار "الہلال" کا مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انگریزوں کے سنسر کی عائد کردہ تمام پابندیوں کے باوجود وہ ان گنے چنے اخباروں میں تھا اور شاید اردو کا واحد اخبار تھا جس نے اپنے قارئین کو بین الاقوامی سیاست کی ہر اونچ نیچ سے واقف کرایا اور ان واقعات کو صحیح پس منظر میں پیش کیا۔ الہلال ہندوستان کی آزادی کا نقیب تھا اور اس کے تمام بیرونی نامہ نگاروں کی رپورٹیں پڑھ جائیے تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح مختلف ملکوں سے آئی ہوئی ان رپورٹوں کو ایک لڑی میں پرو کر پیش کیا جاتا تھا تاکہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو کہ عالمگیر شہنشاہیت بساط عالم پر کونسی چال چل رہی ہے اور اس کا جواب دینے کے لئے اقوام عالم کیا قدم اٹھا رہی ہیں۔ مولانا آزاد کی ادارت میں الہلال نے نہ صرف ہندوستان کے عوام کو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے لئے دعوت دی، بلکہ انہیں یہ بھی بتایا کہ انگریزی سامراج کے خلاف ان کی جدوجہد سامراج کے خلاف دنیا کی تمام آزادی پسند اقوام کی جدوجہد کا ایک جزو ہے اور اس طرح الہلال نے ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے ذہنی افق کو وسعت بخشی، اور ان کے عزم و ارادے کو پختگی دی۔

بین الاقوامی سیاسیات کی حد تک الہلال کا دور ثانی اہم اور دلچسپ ہے۔ یہ دور ۱۹۲۷ء میں شروع ہوا اور اسی سال کے اختتام تک ختم ہو گیا۔ ہم نے اس دور کو اہم اس لئے بتایا کہ اس کے دور اول اور دور ثانی کے درمیانی وقفے میں بین الاقوامی سیاست کا عظیم ترین واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں زار شاہی روس کے محنت کشوں نے فرسودہ جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے اشتراکی ریاست قائم کی۔ اس ایک اہم واقعے نے دنیا کی سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا۔ بین الاقوامی تعلقات کا توازن بدل گیا۔ ان تمام بین الاقوامی واقعات کو اس پس منظر میں دیکھنا ضروری تھا۔

ہندوستان کے مجاہدین آزادی نے بھی انقلاب روس سے جوش و ولولہ حاصل کیا لیکن الہلال نے صرف جوش و ولولہ ہی حاصل نہیں کیا۔ اس کا صحیح تجزیہ بھی پیش کیا۔ ۱۹۲۷ء کی فائل پر نظر ڈالئے تو آپ کو اس کا اندازہ پوری طرح ہو جائے گا۔

انگریزی سامراج، سوویٹ روس کے خلاف جی کھول کے جھوٹا پروپیگنڈہ کر رہے تھے اس کے جواب میں الہلال نے ۲۴ر جون کو جو انگریزی رسالے "کنٹمپریری ریویو" کے ایک مضمون کا اقتباس یہ دکھانے کے لئے پیش کیا کہ انگریزی سامراج کا پروپیگنڈہ کس قدر لچر ہے۔ "بالشویک روس کو ہم اس وقت تک تعصب ہی کی عینک سے دیکھتے رہے ہیں۔ لیکن یہ حالت کب تک باقی رہے گی؟ کب تک حقیقت سے زیادہ ہمیں اپنے متعصبانہ جذبات کا پاس رہے گا؟ روس کے اس انقلاب کو ہم تمدن کا تنزل بتلاتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ طرح طرح کے تمدنی اور تعلیمی ترقیات کے مدارج پوری سرعت کے ساتھ طے کر رہا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم ہر طرح کے تعصبات سے الگ ہو کر اعتدال فکر کے ساتھ روسی انقلاب کا مطالعہ کریں۔"

جس طرح آج ہر ملک کی تحریک آزادی میں سامراجیوں کو "کمیونسٹوں اور روس" کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں بھی خاص طور پر برطانوی سامراج نے قوموں کی آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لئے یہی افسانہ تراشا تھا۔ مثلاً ۱۹۲۷ء میں چین کے قوم پرور عناصر کے متعلق انگریزوں کا یہی پروپیگنڈہ تھا۔ الہلال کے نامہ نگار نے ۲۴ر جون کی اشاعت میں اس کی اس طرح قلعی کھولی۔

"بیرونی دنیا کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ جنوبی چین کمیونسٹ

مسلمانوں نے عموماً اور بنگال کے مسلمانوں نے خصوصاً اس تقسیم کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور اس تقسیم کو خوش آمدید کہا۔ غلط روی کے اس طوفان میں ہم کو دو مسلمانوں کے نام ملتے ہیں جو اس سے الگ تھلگ ہی نہیں رہے، بلکہ اس کی مخالفت کی اور اس کی سزا بھی ان کو بھگتنی پڑی۔ یہ دونوں مسلمان کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے — ڈاکٹر سہروردی اور عبدالرسول۔ موخرالذکر اس کانفرنس کے صدر تھے جو ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کی تحریک کا افتتاح کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی[51]

۱۹۱۱ء میں حکومت نے ہندوستانی رائے عامہ کے آگے سپر ڈال دی اور بنگال کی تقسیم کے فیصلہ کو منسوخ کر دیا۔ اس کے بعد ہی ۱۹۱۲ء میں کلکتے سے الہلال کا اجرا ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کی سیاسی حالت یہ تھی۔

"مسلمانانِ ہند من حیث العموم پولیٹیکل جدوجہد سے بالکل الگ تھلگ رہنے کو اپنی قومی پالیسی سمجھتے تھے اور ملک کی سیاسی زندگی کا میدان صرف ہندوؤں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی، مگر اس کا پالیٹکس بھی صرف یہی تھا کہ ملک کی عام سیاسی ترقی کی روک تھام میں دفتری اقتدار کا ہاتھ بٹائے اور جہاں تک ہو ہر حرکت و ترقی کو روکے۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ مسلمانوں کا پولیٹیکل کام یہ نہیں ہے کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کرے، بلکہ صرف یہ ہے کہ ہندوؤں کی پولیٹیکل جدوجہد کی مخالفت کرے۔ مسلمانوں میں گنتی کے چند افراد جو انڈین نیشنل کانگریس میں شریک تھے ان کے سامنے بھی خود اپنی کوئی راہ نہ تھی

یہ حالت تھی کہ یکایک کلکتہ سے الہلال نکلا اور اس شان سے نکلا کہ تمام ملک کی نظریں بے اختیار اس طرف اٹھ گئیں۔ اس کی ہر بات انقلاب انگیز تھی، اور ہر بات نئی"[52]

---

[52] تذکرہ مقدمہ از ص الف تا ح

"ہندی والوں کو ان کا لسانی تعصب لے ڈوبے گا۔ افسوس! جو اردو زبان اسی ملک کی پیداوار ہے۔ آج اس کے لئے ہمارا دماغ تنگ ہو گیا ہے —— اردو کسی مذہب یا گروپ کی زبان نہیں، بلکہ سب کی زبان ہے۔ اگر اردو کو مسلمانوں کی زبان فرض بھی کر لیا جائے، تو کیا اس ملک کے ساڑھے چار کروڑ باشندوں کے ادارہ کو امداد دینا اعتراض کی بات ہے؟ —— میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ میں بے غرض ہوں، اور جس میں غرض نہ ہو اسے تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی"

ابوالکلام آزاد (پارلیمنٹ میں)

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر برطانوی حکومت پروانۂ راہداری میں رکاوٹیں نہ ڈالتی تو مولانا آزاد ان رہنماؤں میں نہ ہوتے جو اس تقریب میں شرکت کے لئے ماسکو جانے والے تھے

آگے چل کر اخبار نے لکھا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماسکو کا یہ اجتماع دنیا کے عظیم الشان اجتماعات میں سے تھا۔ نہ صرف تمام روسی صوبوں سے بلکہ دنیا کے دور دراز حصوں سے بھی نمائندوں کی بے شمار تعداد شریک ہوئی تھی۔ وسط ایشیا کی تمام حکومتوں اور قوموں کے وکلا موجود تھے۔ قفقاز اور آرمینیا نے علانیہ اس میں حصہ لیا۔ ایران سے بھی ایک وفد آیا تھا۔ چین اور جاپان کے نمائندے بھی موجود تھے۔"

جس کی تفصیل دیتے ہوئے الہلال نے بتایا کہ۔

"تقریب کے رسوم و اعمال نہایت طول طویل تھے جو کئی دن تک متصل جاری رہے۔ سب سے زیادہ اہم اور عظیم الشان اجتماع بین الاقوامی جلوس کا تھا جس سے تقریب کا افتتاح ہوا۔ اس جلوس کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے شرکا کی تعداد دس لاکھ آدمیوں سے بھی زیادہ تھی اور بیس گھنٹے سے زیادہ وقت اس کے گزرنے میں لگ گیا تھا۔ جلوس کا ایک سرا شہر کے کنارے سے شروع ہوا تھا، اور دوسرا سرا چکر کھا کر دوسرے سرے پر ختم ہوا تھا"

الہلال ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء

مدیر الہلال نہ صرف ہندوستان کے زبردست رہنما تھے، بلکہ بین الاقوامی تعاون اور قوموں کی دوستی کے بھی علمبردار تھے۔ انکی بے وقت موت نے بین الاقوامی اتحاد کے بہت بڑے رہنما کو بھی ہم سے چھین لیا۔

الہلال اور کمیونسٹ مینی فسٹو

شاید آپ کو نہ معلوم ہو کہ الہلال پہلا اُردو رسالہ تھا کہ جس نے کارل مارکس اور اینگلز کے "کمیونسٹ مینی فسٹو" کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ تمہید میں لکھا گیا کہ۔

"روس کے آخری انقلاب کے بعد سے کمیونزم دُنیا کی ایک زندہ اور عامل حقیقت ہو گئی ہے اور ہر مُلک کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ نہ صرف سیاسی حیثیت سے بلکہ علمی حیثیت سے بھی اس کے اصول و مبادیات کا مطالعہ کرے اور نقد و بصیرت کے ساتھ صحیح رائے قائم کرے۔"

الہلال ۴ نومبر ۱۹۲۷ء

☆

ارباب صدق ہمیشہ قید وطن و دیار سے آزاد رہے۔ خدا کی ساری خدائی، ان کا وطن، اور ساری زمین ان کا گھرانا ہے۔ جن بیمارانِ دُنیا اور سرمدانِ حق کو وطن میں رہ کر بھی یار و نعمت دنیوی کے مزے نہیں لوٹنے ہیں، بلکہ اپنے بوریائے فقر پر قانع رہ کر علم و عشق کی چاکری کرنی ہے۔ ان کے لئے دُنیا کے کسی ایک گوشے میں کیا دھرا ہے، جو دوسرے گوشے میں میسر نہ آئے گا۔ ان کے علم و حق کی جنس تو وہ متاعِ عالمگیر ہے جس کے لئے خدا کی ساری دُنیا بازار کا حکم رکھتی ہے۔ وہ اپنی جھولی میں حق و صداقت کا تخم رکھتے ہیں اور اس کو لے کر جس سرزمین میں جا نکلیں گے۔ اپنی فصل و کاشت خود تیار کریں گے۔

ابُو الکلام آزاد

روس کے اثر و اقتدار میں ہے۔ وہاں سرے سے
کوئی باضابطہ حکومت ہی نہیں ہے قتل و غارت اور
بے امنی ہے۔ حالانکہ یہ صریح کذب و افترا ہے۔"
"قوم پرست چین ہرگز روسی کمیونسٹوں کے اثر میں
نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس میں کمیونسٹوں کو بہت
قوت حاصل ہے، مگر وہ کمیونسٹ روسی نہیں، خود
چینی ہیں۔ کمیونزم کچھ روس کی ذاتی جائداد نہیں ہے
وہ معاشرتی عقائد کا ایک مذہب ہے اور ہر قوم اسے
قبول کر سکتی ہے۔ بغیر اس کے کہ کمیونسٹ روس کے
ماتحت یا زیر اثر ہو۔"

صرف اتنا ہی نہیں الھلال نے یہ بھی بتایا کہ محکوم قومیں اور خاص طور پر تاتار کے ہاتھوں ستائی ہوئی قومیں سوویت روس کی طرف کیوں جھک رہی ہیں۔

"بلاشبہ قوم پرست چین روس کی طرف مائل ہے
لیکن اس کی وجہ بالکل معقول ہے۔ وہ روس ہی ہے
جس نے دول یورپ کے حلقے سے نکل کر چین کے ساتھ
انصاف کیا۔ وہ مراعات از خود چھوڑ دیں جو اسے
پچھلے غاصبانہ معاہدوں کی رو سے حاصل تھیں اور جن
کے برقرار رکھنے کے لیے برطانیہ جنگ پر تلا ہوا ہے۔"
۲۴ جون ۱۹۲۷ء

بالکل فطری بات تھی کہ الھلال کو مسلم ممالک سے زیادہ دلچسپی ہو۔ لیکن یہاں بھی وہ آپ کو یہ مژدہ سنانا چاہتا ہے کہ مسلم ممالک کے عوام اور حکومتیں برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں اور سوویت یونین ان کی مدد کر رہا ہے۔ مثلاً اس زمانے میں سوویت یونین اور ترکی کے درمیان دوستی کا ایک معاہدہ ہوا۔ اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے الھلال نے ۱۵ جولائی کو ترکی کے ایک اخبار "جمہوریت" کا اداریہ نقل کرتے ہوئے لکھا کہ۔

"ترکی کے اخبار بھی معاہدے پر اظہار رائے کرتے
ہیں۔ قدرتی طور پر ان کی ہمدردیوں کا میلان روس کی
طرف ہے۔"

اس کے بعد "جمہوریت" کے اداریے کے اقتباس پیش کئے ہیں۔ جنھیں یہاں نقل کرنا مضمون کو طول دینا ہوگا۔ اس لئے ہم صرف ایک پیراگراف نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

"اس صورت حال میں کون خیال کر سکتا ہے کہ ہم
ان سرمایہ دار حکومتوں کی دھمکی میں آکر اپنے دوست
(سوویت روس) سے بے وفائی کریں گے؟ ہم ہرگز
بے وفائی کا دھبہ اپنی پیشانی پر نہیں لگا سکتے۔"
الہلال ۱۵ جولائی ۱۹۲۷ء

افغانستان کے سلسلے میں برطانیہ کے خطرناک ارادوں کا ذکر کرتے ہوئے الھلال نے ۲۹ جولائی ۱۹۲۷ء کو لکھا۔

"نہیں جہاں تک حالات کا علم ہے ہم یقین سے کہہ سکتے
ہیں کہ برطانیہ کو افغانستان کے روس سے الگ کرنے
میں ایسی ہی ناکامی ہوگی جیسی ترکی کے معاملے میں
ہو چکی ہے۔ افغانستان روس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا
اسے خوب معلوم ہے کہ برطانیہ اسے ہرگز کوئی نفع نہیں
پہنچائے گا۔ لیکن روس اسے بے شمار نفع پہنچا
سکتا ہے۔"

انقلاب روس کی دسویں سالگرہ

جب نومبر ۱۹۲۷ء کو انقلاب روس کی دسویں سالگرہ منائی گئی تو غالباً الھلال کو اس جشن کی خبروں کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ چنانچہ ۹ دسمبر کی اشاعت میں اس جشن کے متعلق کافی طویل رپورٹ شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ۔

"قارئین الھلال کو اخبارات کے ذریعہ معلوم ہو چکا
ہے کہ گزشتہ اکتوبر میں روس کی سوویت حکومت
نے آخری انقلاب روس کی دسویں سالگرہ منائی
تھی اور اس تقریب کو کمیونزم کی دس سالہ خوبی سے
تعبیر کیا تھا۔ اس تقریب میں شرکت کے لئے بعض
ہندوستانی رہنماؤں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن
ان میں سے کوئی شخص بھی نہ جا سکا وقت کی کمی حالات کی
ناموافقت اور زیادہ تر ہندوستانی حکومت کے برخلاف راہ
داری دیے گئے استثناء سے کسی خاص شخص نے قصد ہی نہیں کیا۔"

قیام مکہ میں انہوں نے (مولانا خیرالدین نے) وہاں کے مفتی اکبر کی بھانجی سے نکاح کر لینے کے بعد ان کے اصرار کے موجب مستقل سکونت مکہ میں ہی اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہاں کے دستور کے مطابق اسوقت کوئی شخص سرزمین حجاز پر ایسی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ نہیں رکھ سکتا تھا جب تک کہ وہ شریف مکہ کی رعایا ہونے کا حوالہ نہ حاصل کرلے۔ چنانچہ مولانا خیرالدین نے مکہ کی رعیت ہونا قبول کر کے وہیں ایک مختصر سا قطعہ زمین خرید کر ایک ذاتی مکان بنا لیا جو محلہ قدوہ متصل دارالسلام میں واقع تھا اور اس طرح ہندوستان کی واپسی کا خیال ترک کر دیا۔

لیکن اچانک ایک ایسا حادثہ پیش آگیا کہ انہیں مجبوراً ہندوستان کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ اسی عرصہ میں ان کے پاؤں کی ہڈی کسی وجہ سے گر جانے کے باعث ٹوٹ گئی اور اسوقت چونکہ مکہ میں ڈاکٹری علاج کا کوئی معقول بندوبست نہیں تھا۔ اور جس ڈاکٹر نے ان کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑا تھا، ٹھیک طور پر نہ جڑنے کے باعث اس میں اور زیادہ تکلیف پیدا ہوگئی۔ چنانچہ علاج کے لئے انہیں مجبوراً ہندوستان واپس آنا پڑا۔ یہاں علاج سے فائدہ ہوگیا لیکن معمولی سی لنگ آخر تک باقی رہی۔ ہندوستان آنے پر انکے مریدین اور معتقدین کے حلقے نے اس طرح سے انہیں گھیرا کہ دوبارہ واپس مکہ جانے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ اور انہیں مجبوراً کلکتہ میں قیام کرنا پڑا۔ اسی سال ایک بڑا حادثہ یہ ہوا کہ ان کی اہلیہ محترمہ (مولانا آزاد کی والدہ) انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ اس سانحہ کا ان کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے دوبارہ مکہ کا قصد کیا، لیکن بعض علایق ایسے تھے کہ یہاں سے واپسی ممکن نہ ہو سکی۔

مولانا خیرالدین مرحوم، جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے، اپنے وقت کے جید عالم، جلیل القدر بزرگ اور صوفی صافی تھے۔ اور ساتھ ہی مشرقی اور خالص اسلامی تہذیب کے سراپا مرقع۔ انہیں کے زیر تربیت مولانا کی تعلیم، پرورش، ساخت و پرداخت اور ذہنی نشوونما ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جو قدیم اسلامی تہذیب و تمدن اور جاگیردارانہ مذہبی ماحول کا مخصوص ترین نمائندہ ہو۔ اس کی نگرانی میں تعلیم و تربیت کا طریقہ اور سسٹم کیا رہا ہوگا۔ مولانا آزاد کو بچپن ہی سے عربی و فارسی کی مذہبی تعلیم دی گئی تھی اور سختی کے ساتھ اس بات کا بندوبست کیا گیا تھا کہ مغربی تہذیب کی ابھرتی ہوئی کرنوں کی طرف ان کی نظر نہ جاسکے۔ چنانچہ زمانۂ تعلیم میں انہیں انگریزی علوم کی طرف دھیان دینے کا موقع نہیں ملا، یہ بات اور ہے کہ اپنی استعداد اور ذہانت کے طفیل انہوں نے بعد کو انگریزی علوم و فنون سے گہری واقفیت حاصل کر لی تھی۔

اپنی تعلیم و تربیت کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ:-

"والد کو ہماری تعلیم کے بارے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ ایک طرف تو ان کو علمائے وقت سے عام طور پر مذہبی سوئے اعتقاد کی بدگمانی تھی اور ڈرتے تھے کہ ہم لوگوں پر وہابیت کا کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ دوسری طرف علمی حیثیت سے بھی طبیعت میں ایسی بلندی واقع ہوئی تھی کہ کوئی ان کی نگاہ میں جچتا نہ تھا۔ خود طرح طرح کے مشاغل جاری کر رکھے تھے اس لئے پورا وقت نکالنا مشکل تھا۔ اور اسی لئے اس بارے میں برابر متفکر رہتے تھے"

تربیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر بیان کیا ہے:-

"والد کی تربیت اس درجہ شدید اور سخت تھی کہ بہت کم لوگوں کو اس کا تصور بھی ہو سکے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ باہر کی ذرا سی بھی آب و ہوا ہمیں گندا کر دے گی۔ انہوں نے ابتدا ہی سے یہ اسلوب رکھا تھا کہ ہماری پوری دنیا، کھیل کود کی، سیر و تفریح کی، تعلیم کی، جو کچھ بھی، صرف اپنا مکان یا انکا حلقۂ تربیت۔ بجز ان کی معیت یا اجازت کے جو بہت کم وقوع میں آتی تھی ہم چوکھٹ سے باہر قدم نہ رکھ سکتے تھے۔"

ان حالات میں مولانا کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا کے والد جو اپنے وقت کے مجتہد اور مشہور عالم تھے، ان سے اور انکی وساطت سے وقت کے دوسرے کاملین اور اساتذہ سے انہیں تعلیم و درس کا موقع ملا، اور پھر ایک ایسے ماحول میں جہاں سوائے لکھنے پڑھنے، کتاب و قلم، اور درس و تدریس کے اور کچھ نہ تھا، قدرتاً ان کے ذہن میں تعلیم کی طرف گہری رغبت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ یہی ایک چیز تھی جو اس ماحول میں، کھیل کود، سیر و تفریح، اور دوسرے مشاغل کے مترادف تھی۔ اس عہد کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:-

"لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں۔ مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لیکر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظر سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے۔ اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے

سیّد شہیر الدّین

عجب آزاد مرد تھا

(مختصر سوانح حیات)

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تم کو میر سے محبت نہیں رہی

مولانا محی الدین احمد المعروف بہ مولانا ابوالکلام آزاد نومبر ۱۸۸۹ء میں بمقام محلہ قدوہ، متصل باب السلام پیدا ہوئے تھے آپکا شجرۂ نسب عہد اکبری کے مشہور صوفی بزرگ اور عالم الدین حضرت مولانا خیر الدین احمد سے ملتا ہے آپ اپنے وقت کے فرید عالم، صوفی پارسا اور شیخ طریقت تھے۔ اور ملک کے طول و عرض میں ان کے معتقدین ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انگریزی استبداد اور ظلم و تشدد سے تنگ آکر آپ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور مکہ معظمہ میں جاکر پناہ لی، مولانا آزاد نے خود ان کے حالات علی‌التفصیل بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے:۔

"میرے والد مولانا خیر الدین ۱۸۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والدین کا صغر سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے نانا کے یہاں پرورش ہوئی یہ زمانہ دہلی کا ایسا زمانہ تھا کہ قدیم اسلامی دارالحکومت نے آخری سنبھالا لیا تھا۔ اس لئے ہر علم و فن کے اچھے اچھے لوگ جمع تھے اور ان کی (والد) بانی جو کچھ معلوم ہوا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں ایسی تعلیم و تربیت اور نشوونما کے لئے ایسا وسط میسر آیا تھا جو تھوڑے دنوں بعد ہندوستان سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا"

سفر مکہ کے حالات درج کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے۔

"جب ان[1] کے ماما نے ہجرت کا ارادہ کیا تو یہ بھی انکے ساتھ روانہ ہوئے۔ بھوپال میں بھی ساتھ مقیم رہے اور وہاں سے مکہ معظمہ گئے۔ یہاں مولانا محمد یعقوب[2] اسوقت زندہ تھے ان سے سند حدیث کی تجدید کی۔ اور اس طرح شاہ صاحب کا سلسلہ ایک واسطے کی کمی سے حاصل ہو گیا"

ہندوستان چھوڑنے اور عزم ہجرت کے ساتھ مکہ کا سفر اختیار کرنے کی وجوہات ظاہر کرتے ہوئے مولانا سے روایت ہے:۔

"غدر سے پہلے علمائے دہلی کا یہ حال تھا کہ ہندوستان کی حالت اور بربادیاں دیکھ کر عموماً یہاں کے قیام سے برگشتہ خاطر ہو گئے تھے۔ اور ایک ایک کر کے یہاں سے روانہ ہونے لگے تھے۔ عام طور پر ہر سال بڑی بڑی جماعتیں جایا کرتی تھیں۔ جو قافلہ کے نام سے مشہور تھیں"

مولانا خیر الدین بھی یہاں کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر عازم ہجرت ہوئے مدینہ منورہ کے مفتی اکبر شیخ محمد ظاہر نے ان کے ساتھ اس درجہ خصوصیت اور شفقت کا برتاؤ کیا کہ آخر اپنی بھانجی سے ان کا عقد کر دیا۔ اور انہیں کے بطن سے مولانا آزاد تولد ہوئے۔ عمر کے ابتدائی دس سال مکہ ہی میں بسر ہوئے۔ اور ابتدائی تعلیم کا آغاز بھی یہیں ہوا

مولانا خیر الدین مرحوم کے معتقدین اور مریدین کا ایک بڑا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بمبئی، کاٹھیاواڑ، گجرات، سیلون حتی کہ افریقہ تک میں ان کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

---

[1] آپ غدر سے آٹھ سال پہلے ہجرت کر کے مکہ چلے گئے تھے۔

کتابوں کا لسٹ کر مطالعہ کرتا۔ اکثر ایک ایک دو دو گھنٹے سب تک مشغولیت رہتی۔ اس کی وجہ سے اسوقت میری صحت میں فتور آنے لگا۔ یہ ٹھیک دس سے بارہ برس کی عمر کا واقعہ ہے والد اس کے بہت مخالف تھے تاہم درسی کتابوں کی تحصیل کی بھی ایک مقدار تھی، اس میں حفظ صحت اور تفریح کا کہاں وقت نکل سکتا تھا اصل یہ ہے کہ طبیعت کو ابتدا ہی میں جب اس طریق پر ابھرنے کا موقع نہ ملا، تو اس کے تمام جذبات مرجھا گئے اور پھر اس طرف ایسے لگے کہ تمام جذبات کا مصرف مطالعہ و درس ہی ہو گیا"۔

بارہ تیرہ سال کی عمر تھی کہ مولانا نے عربی، فارسی کی درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری غیر درسی اور اردو کی کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔ باوجودیکہ اس راستے میں ان کے لئے بڑی بڑی رکاوٹیں تھیں۔ والد کی ناراضگی اور ناموافق ماحول کی عدم مطابقت، درسیات کا بوجھ۔ یہ سب کچھ ایسا تھا کہ کسی دوسری طرف دھیان دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا تاہم مولانا کی فطری مناسبت جو علم و ادب کے ساتھ ان کو تھی، برابر اپنا کام کرتی رہی، انہیں نوں انہیں شاعری کا شوق ہوا اور اس قلیل عمر میں شعر گوئی کی مشق کرنے لگے۔ ان کی عمر کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرتا تھا کہ یہ لڑکا جو دیکھنے میں بہت کم سن نظر آتا ہے ایسے بلند پایہ اشعار بھی کہہ سکتا ہے اسوقت ہی مولانا کے اشعار وقت کے اہم اور معیاری رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ اپنی شاعری کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے۔۔

"یہ عجیب بات ہے کہ درسیات سے باہر جس چیز سے سب سے پہلے میں آشنا ہوا وہ شاعری تھی۔ مجھے یہ ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل کیونکر میں اس چیز سے واقف ہوا لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ زیادہ شوق اس کا مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی ایک شخص کی وجہ سے، جو مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی کے ایک مستقل شاگرد تھے اور اردو و فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔۔ اسوقت میری عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی اسی زمانہ میں کلکتہ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا اسکا انتظام پٹنہ کے بادشاہ میاں نامی ایک رئیس نے کیا تھا۔ اسلئے کلکتہ سے باہر کے بھی مشہور اشخاص مثلاً جلال مرحوم بلائے گئے تھے تین طرحیں دی گئی تھیں، جن میں ایک یہ تھی سہ

مطلب کی بات صاف کہوں کیا مجال ہے

تین دن تک مشاعرہ جاری رہا۔ مولوی عبدالواحد نے غزلیں لکھی تھیں، اور مشاعرہ میں پڑھی تھیں۔ انہوں نے اسکا حال ہم لوگوں کو سنایا، اور اپنی غزلیں بھی سنائیں یہ پہلی منظم دلچسپی ہے جو میرے حافظہ میں شاعری کی نسبت پائی جاتی ہے"۔

ایک اور جگہ اپنی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے اپنے ایک خط میں اس طرح اظہار کیا ہے:

"اسی زمانہ میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر خاں شوخ رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے انہیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں — ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے، جس کی دوکان مسجد سے متصل تھی، کہنے لگے ایک شاگرد نے غالب کی طرح میں ڈال دی ہے چند شعر اسی وقت کہہ دو میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں انہوں نے زمین بتلائی یاد نہ ہو، جو یاد نہ ہو، میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر لکھ دئے۔ کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا

عہد وصل بھی کچھ طاہر ہے تو کیا ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو بھی یاد نہ ہو

کہنے لگے صورت سے تو بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو، لیکن حد کی قسم مجھ کو باور نہیں کرنا۔ اسوقت سوچتا ہوں تو یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو"

لیکن مولانا کو شعر و شاعری کا ذوق کچھ زیادہ عرصہ نہیں رہا اور انہوں نے جلد ہی یہ سلسلہ بند کر دیا یہ بہت ممکن تھا کہ اگر مولانا کی طبیعت آئندہ بھی اس طرف راغب رہتی تو وہ دنیائے شاعری میں بھی اپنا ایک مستقل مقام اور مرتبہ حاصل کر لیتے لیکن انہیں تو ہر راہ میں گام فرسائی کرنی تھی۔ ہر میدان میں قدم بڑھانے تھے ہر وادی کی خاک اڑانی تھی ان کا مزاج کسی ایک پہلو پر پرسکون ہو کر بیٹھنا جانتا ہی نہ تھا۔ چنانچہ جلد ہی وہ صحافت کی طرف راغب ہو گئے— صحافت کا پہلا تجربہ ایک گلدستہ کی شکل میں کیا جس کو ان کی شاعری کا مقام آخر کہنا چاہیئے۔ کہتے ہیں:-

اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھئے تو درخت ہی درخت تھے اور اندر بیٹھئے تو ایک چھوٹی سی جگہ ہے اور ایسا [illegible] کچھ بھی نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ ابھی یہ جھنڈ ہے یا نہیں؟ میں جب سیر کو جاتا تو ایک کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا — والد مرحوم کے خادم حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے وہ ٹہلتے رہتے اور بھلا بھلا کر کہتے "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلا کیوں تھا؟" — یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے [illegible] اسی طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ [illegible] کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا، [illegible] میں نے چن لیا تھا کیونکہ اس طرف لوگوں کا گذر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اس کے اندر گم رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آتا ہے تو دل کا عجب حال ہوتا ہے۔

عالمے غیر کا طرفہ تماشا بود [illegible]
حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم

اگرچہ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو، میرے چاروں طرف اس کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کن شہر تھا۔ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رخ ہی نہیں کرتی تھی۔

ہم تو [illegible]
[illegible]

والد مرحوم میرے اس شوق علم سے خوش ہوتے تھے۔ مگر فرماتے یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ لے گا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری، مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی نہ سنبھل سکا —"

تحصیل علم اور شوق کا عالم یہ تھا کہ بچپن میں جو پیسے تماشہ کے لئے ان کو ملتے تھے، وہ انہیں کسی دوسری طرح سے ضائع نہ کرتے بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرتے رہتے۔ اور پھر ان سے اپنے شوق اور پسند کی کتابیں خرید لیتے — فرماتے ہیں:۔

"دس برس کی عمر میں مجھے کتابوں کا اتنا شوق ہو گیا تھا کہ جو پیسے ملتے تھے ان کو جمع کرتا تھا اور ان سے کتابیں خریدتا تھا"

کتابوں کے اشتیاق اور مطالعہ کی طلب نے انہیں کائنات علم و ادب کی ایک ایک راہ اور ایک ایک وادی کی طرف کھینچا، اور ان کی فطرت اس بات پر قانع نہ رہی کہ صرف نصابی اور درسی کتابوں پر اکتفا کرے۔ انہوں نے اس سے آگے قدم بڑھائے اور وہ ان گنت موضوعات جو ان کے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے ان سب نے ان کے دل کو اپنی طرف کھینچا۔ اگرچہ گھر کا ماحول اور والد کی سخت نگرانی اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ درسی نصاب کے علاوہ کوئی دوسری چیز ان کی نظر سے گذرے، تاہم وہ ان بندشوں میں زیادہ عرصہ تک مقید نہ رہ سکے اور بندشوں کی باڑھ کو توڑ کر طلب نے اپنا راستہ نکال لیا۔ اس حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے اپنے شوق علم کی داستان اس طرح بیان کی ہے:۔

"اس اثنا میں — مجھے اردو کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا یہ بھی گویا ایک علمی بدچلنی تھی، جس کو ہم صرف ایک جرم کی طرح محض مخفی طور پر ہی کر سکتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ یہ شوق کبھی کھیل کود کا شوق نہ تھا"

مولانا آزاد کے والد اپنے اوقات اور معمولات زندگی کے اس قدر پابند تھے، کہ سخت سے سخت حالات میں بھی ان میں ذرہ برابر فرق کا پیدا ہونا انہیں کسی صورت گوارا نہ ہوتا تھا۔ معمولات کی رو سے مولانا کو صبح کی وقت نماز سے فارغ ہو کر والد سے سبق لینا پڑتا تھا۔ اس کے بعد باہر جو استاد پڑھاتے تھے، ان کے سبق کا وقت آ جاتا۔ دوپہر کو صبح کا آموختہ یاد کرنے اور آگے کی تیاری کرنے میں کٹ جاتا۔ سہ پہر کو پھر والد صاحب کی خدمت میں حاضری ضروری ہوتی، اور پڑھے ہوئے سبق کو دوہرانا ہوتا۔ مغرب کے بعد پھر ایک سبق والد سے لیتے۔ اس طرح وقت کا سارا حصہ درسی کتابوں کی نذر ہو جاتا، اور مولانا کی بے چین طبیعت جو اس سے آگے بڑھنے اور طرح طرح کی راہوں پر چلنے کے لئے بے چین تھی، کسی طرح سکون نہ پاتی چنانچہ انہوں نے اس کا ایک دوسرا راستہ نکالا۔ کہتے ہیں:۔

اب جو وقت رہ گیا وہ صرف سویرے ہی کا تھا — اپنے شوق کے مطالعہ کے لئے صرف اسی میں بچت نکل سکتی تھی چنانچہ میں لیمپ کے پیچھے کتابیں رکھتا اور موم بتی جلا کے مطالعہ کرنے لگتا۔ اگر دن کو اور کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا تو درسی

جاری کیا۔ قوم کی ترقی اور اصلاح اس اخبار کا واحد مقصد تھا۔ معاصر اخبارات نے اس پر جس طرح تبصرے کئے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مولانا کو ایک پختہ کار، کہنہ مشق اور تجربہ کار صحافی خیال کرتے ہیں۔ اسوقت مولانا کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ اخبار ۱۹۰۲ء تک مولانا کی ادارت میں انجمن ترقی اردو کے آرگن ہونے کی حیثیت سے بھی نکلتا رہا اور جب مولانا کو عراق کا سفر پیش آیا تو اخبار بند ہو گیا۔

عراق سے واپسی کے بعد مولانا آزاد نے شبلی مرحوم کے پیہم اصرار کے بعد "الندوہ" جیسے علمی اور ادبی جریدے کی ادارت کے فرائض سنبھالے۔ مولانا شبلی کہا کرتے تھے، کہ تمہارا ذہن اور دماغ عجائب روزگار میں سے ہے اور تمہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور نمونہ پیش کرنا چاہیئے۔ سات آٹھ مہینے "الندوہ" کی ادارت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد چونکہ مولانا کو بعض اہم واقعات کی بنا پر لکھنؤ سے بمبئی آ جانا پڑا تو یہیں شیخ غلام محمد مالک اخبار "وکیل" سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بے حد اصرار و اشتیاق کے بعد مولانا کو "وکیل" کی ادارت کے فرائض سونپ دیئے۔

ایک سال تک مولانا وکیل کی ادارت کا کام انجام دیتے رہے۔ اسی اثناء میں مولانا کے بڑے بھائی مولانا ابو النصر آہ کا انتقال ہوا اور ان کے والد نے امرتسر سے ان کی واپسی پر اصرار کیا۔ چنانچہ مولانا کلکتہ واپس آ گئے، کچھ دن دار السلطنت سے وابستہ رہے پھر چند اختلافات کی بنا پر دار السلطنت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی سیاست ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ تقسیم بنگال کی سازش نے حالات میں زیادہ تندی اور سختی پیدا کر دی تھی۔ برطانوی اقتدار اور غلامی کے خلاف جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ اور قوم اپنے دشمن کے خلاف صف آرا ہونے لگی تھی۔ ادھر مسلمانِ ہند سر سید کی تحریک کے ساتھ انگریز پرستی اور وفاداری کی افیون کے نشہ میں اونگھ رہے تھے۔ مولانا آزاد کی آنکھیں یہ سب تماشہ دیکھ رہی تھیں، چنانچہ انہوں نے وقت کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھیں۔ اور حالات کے تقاضوں کو محسوس کر کے ۱۹۱۲ء میں جنگ آزادی کا سب سے بڑا نقیب، نڈر، بے باک اور بے لاگ اخبار "الہلال" جاری کیا۔ الہلال کی تاریخ جنگ آزادی کی ایک ناقابل فراموش تاریخ ہے۔ اور اردو صحافت کی ایک نئی مضبوط اور طاقتور بنیادوں کی امین۔ اس اخبار نے ملک کے کونہ کونہ میں اور خاص طور پر مسلمانوں کے حلقہ میں ایک ہلچل اور زلزلہ پیدا کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں مولانا نے "البلاغ" جاری کیا۔ اس وقت تک مولانا کی سیاسی اور صحافتی زندگی اچھی طرح چمک چکی تھی اور وہ مجاہد آزادی کی حیثیت سے انگریز گورنمنٹ کی نظر میں کھٹکنے لگے تھے۔ آخر حکومت نے طرح طرح کے الزامات اور ظلم و استبداد کے حربوں سے مولانا کی اس زلزلہ انگیز آواز کو بند کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں انہیں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء تک مولانا آزاد رانچی میں نظر بند رہے اور جب رہا ہو کر واپس آئے تو ملک میں رولٹ ایکٹ کے خلاف زبردست تحریک چلائی جا رہی تھی۔ اور سر زمین ہند آتش فشاں کی طرح کھول رہی تھی۔ مولانا آزاد جن کے دل میں آزادی کا سچا جذبہ اور مادر وطن کی محبت کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا، یہ دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے اور آنکھیں بند کر کے سیاست کے عملی میدان میں ایک بہادر سپاہی کی طرح شمشیر بکف ہو گئے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کی ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی۔ یہ مولانا کی مہاتما گاندھی کے ساتھ پہلی ملاقات تھی، اور اس سلسلہ میں تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کا ایک ڈیلی گیشن ترکی کے معاملہ میں وائسرائے ہند سے ملنے جا رہا تھا اور مولانا آزاد کا نام بھی اس وفد کے ارکان میں شامل تھا۔ مولانا نے اس وفد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ بھیک مانگنے اور گداگری کرنے سے آزادی اور مقصد براری نہیں ہوتی۔ اس پر انہوں نے اسوقت کے بڑے بڑے لیڈروں مولانا شوکت علی، محمد علی، عبد الباری مرحوم سب کی پر زور مخالفت کی۔ اور اسکے بعد انگریزوں کے خلاف ایک طاقتور تحریک کا ساتھ دیا جو جنگ آزادی کی تاریخ میں "ترک موالات" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد پرنس آف ویلز کی آمد پر دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مولانا آزاد کو بھی کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال کیلئے قید میں ڈال دیا گیا۔ رہائی کے بعد جب پھر وہ عملی میدان میں آئے تو رنگ ہی دوسرا پیدا ہو گیا۔ انگریز کی سیاست ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت اور طبقہ داری نزاع پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور دو قومی نظریے کا ثبوت سامنے آ چکا تھا۔ ادھر خود کانگریس میں زبردست اختلافات پیدا ہو چلے تھے۔ ایسے میں مولانا کو کانگریس کی صدارت دی گئی۔ انہوں نے کانگریس کے دونوں گروپوں میں تصفیہ کرایا اور حصول آزادی کی عام تحریک کے ساتھ پارلیمنٹری تحریک کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۰ء میں سائمن کمیشن کے خلاف چلنے والی تحریک میں مولانا آزاد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ جیل کی زندگی میں جب انہیں عملی طور پر سیاست سے الگ ہو جانا پڑتا تھا، تو وہ اپنے علمی اور ادبی ذوق کی پرورش میں لگ جاتے تھے۔ "ترجمان القرآن" کی نئی ترتیب اور "غبار خاطر" جیل کی زندگی کی ہی دین ہے۔ ۱۹۳۹ء میں مولانا کانگریس کی صدارت کیلئے دوبارہ منتخب کئے گئے اور ۱۹۴۶ء تک متواتر اس عہدہ پر مامور رہے۔ ۱۹۴۶ء کے بعد جب عبوری گورنمنٹ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا کو وزارت تعلیم کی مسند پر متمکن کیا گیا اور آخر تک وہ اس عہدہ پر قائم رہے۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ایک عظیم انسان کی عظیم الشان تاریخ کا آخری باب پورا ہو گیا اور مولانا آزاد ہمیشہ کیلئے ہم سے رخصت ہو گئے۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

"طبیعت کا شوق اسقدر بڑھا کہ ایک گلدستہ نکالنے کا
خبط ہوا ۔ گلدستہ بلا روپیہ کے نکل نہیں سکتا تھا مگر اسوقت
کے حالات بھی عجیب تھے ۔ ہمارا احساس یہ تھا کہ جس قدر بھی روپیہ
کی ضرورت ہے صرف پہلے نمبر کے لئے ہے اور جہاں ایک نمبر
نکل گیا تو تمام دنیا اس طرح اس کے انتظار میں ہے کہ فوراً
ہزاروں آدمی اس کے خریدار ہو جائیں گے، پھر روپے کی کیا
کمی رہے گی ۔۔۔ چنانچہ ہم نے اسوقت کے چھپنے اور طالبعلمی
کی بے سروسامانی میں پچاس روپیہ کا انتظام کیا ۔ لیتھو کا ایک
پریس "بادی پریس" کے نام سے ہیرسن روڈ کلکتہ میں تھا والد
مرحوم کی بعض چیزیں وہاں چھپا کرتی تھیں ۔ ہم نے وہیں طباعت
کا انتظام کیا ۔ اور فوراً اعلان چھاپ کر تیار کر دیا اعلان کا
مضمون عبدالواحد نے لکھا تھا ۔ اس کا نام "نیرنگ عالم" تجویز
کیا گیا ۔۔۔ اس تصور سے طبیعت کو کسی قدر مسرت حاصل
ہوتی تھی کہ عنقریب ایک ایسی چیز نکلے گی، جس کی لوح پر میرا نام
بحیثیت مالک و ایڈیٹر کے درج ہوگا ۔۔۔"

"نیرنگ عالم" کے تین چار شمارے مشکل تمام مولانا نکال پائے تھے، اور پھر یہ گلدستہ بند ہو گیا ۔ بتدریج مولانا کی طبیعت مضمون نگاری کی طرف رجوع کرتی گئی ۔ اور انہوں نے اس راہ میں پوری توجہ اور سرعت کے ساتھ قدم بڑھانا شروع کر دیئے ۔ مضمون نگاری کے ابتدائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے بیان کیا ہے ۔

"اس زمانہ میں اردو زبان کبھی میری بھی نہ تھی، اور
مادری اثر غالب تھا ۔ کلکتہ میں بجز والد کے اور کسی اہل زبان
کی صحبت میسر نہ تھی ۔ تاہم شاعری کے ذوق نے بہت جلد اس
کمی کو پورا کر دیا مگر کتابت و انشاء کے لئے بجز مطالعہ کے
اور کوئی رستہ راہ نما نہ تھی ۔ بہرحال اپنے طور پر مضامین لکھنے
لگا اور آہستہ آہستہ مطالعے سے موضوع اور مطالب کے
جمع و اقتباس کی بھی راہیں نکلنے لگیں ۔"

اسی کے ساتھ ساتھ مولانا کو خطابت اور تقریر کا شوق بھی پیدا ہوا لکھتے ہیں ۔

"تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا
اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک
درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا ۔ تاکہ جو کتابیں پڑھی
جا چکی ہیں، وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ سمجھ جائیں اس لئے
والد مرحوم نے چند طلبا کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی
شروع کرا دیا ان میں قندھار کے ایک خان صاحب تھے جن کی
داڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی اسی زمانہ میں تقریر کی
طرف طبیعت راغب ہوئی ۔۔۔ سب سے پہلی تقریر میں نے
۱۹۰۳ء میں کی اسوقت عمر پندرہ سال تک پہنچی تھی ۔ غالباً
دوسرے سال انجمن حمایت الاسلام کے جلسہ میں شریک ہوا تھا ۔
اور تقریر کی تھی اسوقت سولہ برس کی عمر تھی ۔"

تحریر و تقریر کی مشق کے ساتھ ساتھ صحافت کی لگن بھی بتدریج مولانا کے دل میں پروان چڑھ رہی تھی ۔ اور عملی شکل میں نمودار ہونے کے لئے بے چین تھی ۔ چنانچہ مولانا کی صحافتی زندگی کی عملی شکل سب سے پہلے "المصباح" میں ظاہر ہوئی اس اخبار کے متعلق مولانا نے خود بیان کیا ہے

"محمد موسیٰ نامی ایک شخص نے نیا نیا اخبار جاری کیا تھا
اس نے خیال کیا کہ تجارتی اغراض سے کوئی اخبار نکالے ۔ یہ
میرے خاص ذوق کی بات تھی میں نے اور زیادہ ترغیب دی
اور بالآخر وہ آمادہ ہو گیا "مصباح المشرق" مصر سے نکلتا
تھا ۔ میں نے اس کا نام "المصباح" تجویز کیا اور ہفتہ وار اخبار
کی شکل میں جاری ہوا یہ دراصل پہلا اخبار ہے جو میں نے
ایڈٹ کیا ۔ یہ ٹھیک ۱۹۰۱ء کے اواخر کی بات ہے "

مولانا کی مضمون نویسی اور صحافتی زندگی کی باقاعدہ ابتدا دراصل "احسن الاخبار" سے ہوئی ہے مولوی احمد حسین مرحوم فتحپوری نے کلکتہ کے ایک تاجر کتب اور مالک مصطفائی پریس کو اس بات پر تیار کیا کہ ان کی شرکت میں اخبار جاری کریں ۔ چنانچہ "احسن الاخبار" نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا گیا مولانا لکھتے ہیں ۔

"اس اخبار کی اشاعت سے اسوقت مجھے بہت فائدہ
ہوا ایک تو قریبی مصرف طبع آزمائی پیدا ہونے کی وجہ سے
ہر طرح کی مضامین نویسی کے لئے قومی تحریک و تشویق ہوئی ۔
دوسرے اخبار کا ایک دفتر قائم ہو جانے کی وجہ سے تبادلے
کے اخبارات و رسائل دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملا "

جب "احسن الاخبار" بند ہوا تو تبادلے میں آنے والے اخبارات و رسائل بھی بند ہونے لگے تشنگی ذوق کو سیراب کرنے کے لئے مولانا نے "لسان الصدق"

طاری نہیں ہوتی۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ موت کی مجال ہی نہیں کہ اپنا بے رحم ہاتھ لفوسِ قدسیہ کی طرف بڑھا سکے

بات یہ ہے کہ راہ حق کے مسافر، انسانیت کے علم بردار علم و فکر کے معلم ہوتے ہیں مر جائیں تو علم بھی مر جائے، فکر بھی ناپید ہو جائے انسانیت ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

طاغوت کی کوشش رہی ہے کہ انسانوں کو مار ڈالے زمین کے نور کو بجھا ڈالے سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا گیا۔ افلاطون کو بے وطن ہونا پڑا ابراہیم خلیل اللہ کو دہکتی آگ میں جھونک دیا گیا۔ حضرت مسیح کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ مگر کیا یہ برگزیدہ ہستیاں مر کھپ چکی ہیں، مٹ گئی ہیں، فنا ہو چکی ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں — انسانیت کے علم بردار علم و معرفت کے پیامبر، بشری رفعتوں کے معمار آج بھی زندہ ہیں اسی جسمانی زندگی میں جیسے زندہ تھے اس سے کہیں زیادہ توانائی و شادابی کے ساتھ اس وقت بھی زندہ ہیں۔ ہمارے آپ کے دلوں میں زندہ ہیں اور ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں میں قیامت تک زندہ رہیں گے۔ انسانی ہیروؤں پر موت طاری نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ تو خود خدا کے ساتھ زندہ رہیں گے کیونکہ خدائی علوم کے وارث ہیں

اور مولانا؟ — اللہ اکبر! — مولانا نے آ کیا ہے دیکھا موت کی سی بے حسی ہم پر چھائی ہوئی تھی۔ انگریزی حکومت کی غلامی پر ہم فخر کرتے تھے انگریز کی وفاداری کو اپنی قومی زندگی یقین کرتے تھے برطانیہ کو ستارہ ترکی "اسلامی سلطنت" کہا کرتے تھے سیاسیات میں ہم گھسٹتے اور ہندوؤں میں ہماری حیثیت بے بس غلاموں کے بے شعور چوپاؤں سے زیادہ نہ تھی

اور ہم مسلمان بھی کہاں تھے — قرآن کو جزدانوں میں لپیٹ کر گھروں میں رکھنا ہی ہمارا اسلام تھا یا پھر اندھی تقلید تھی۔ تیرے تو تھے، قبریں تھیں، مزار تھے پیران ریاکار کے جال تھے دجیل دغا لوں کے چٹکلے تھے

زمانے کی ضرورتوں سے ہم بے خبر تھے، سمجھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اسلامی دنیا سے غافل تھے۔ بس سلطان روم کو جانتے تھے، اور یقین میں سلطان روم کے ہاتھ کٹ جانے کے بعد پھر سے نکل آنے پر یقین کیا کرتے تھے۔

دفعتاً ایک صور کی زلزلہ انگیز آواز نے مشرق کے ماتمی کو ہلا ڈالا اور ہم آنکھیں ملنا بھی بھول کر دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے، اب ہم مسلمان تھے۔ انسان تھے۔

اسلام کا درد پیدا ہو گیا۔ دین کی محبت جاگ اٹھی۔ وطن کی عزت و عظمت کے جذبے سے ہم بھرپور ہو گئے۔ جہاد کے ولولوں نے ہمارا خواب و خور حرام کر دیا اسلامی دنیا سے رشتے جڑ گئے اور وہی برطانیہ عظمیٰ جو ہمیں بھیڑوں کا گلہ یا گاجر مولی سمجھنے کا عادی چلا آ رہا تھا ہمارے خوف سے کپکپانے اور تھرانے لگا — یہ صورِ قیامت کس نے پھونکا؟ ابوالکلام کے سوا کون ہو سکتا تھا —؟ سنئے تو

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ انسانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خوابِ موت بیدار ہو جائیں — آہ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوالِ امت کے زخموں پر ناز ہے کہاں ہیں وہ جگر جو آتشِ غیرت و حمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟ — اور پھر آہ کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے ماتم گسار اس برباد شدہ قافلہ کے نالہ ساز؟ اس صفِ ماتم کے فغاں سنج، اور اس کشتی طوفانی کے مایوس مسافر، جن کی موت و حیات کے آخری لمحے جلد از جلد گذر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش، روتے ہیں یا مایوسی سے چپ و راست تکتے، مگر نہ ان کے ہاتھوں میں اضطراب ہے نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام نہ ارادوں میں عمل کا ولولہ، دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہلِ شہر رونے میں مصروف ہیں ڈاکوؤں نے قفل توڑ دئے اور گھر والے سوتے ہیں —" الہلال

اور سنئے —؟

"آہ تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی اور تمہاری بیمد کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں اور کیس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جائے۔ یہ کیا ہو گا کہ ہانکوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو؟ اور کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاغوت چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے تھے

عبدالرزاق ملیح آبادی

..... صحبت یار آخر شد

دوستو! مولانا مرے نہیں ہیں۔ مر بھی نہیں سکتے۔ مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ زندہ ہیں، زندہ رہیں گے۔ ہاں بس اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہم سے ذرا اوجھل ہو گئے ہیں۔

اور یہ کوئی عجیب، انوکھی، ان ہونی بات بھی نہیں۔ مولانا اپنی مادی زندگی میں ہی حقیقت کبریٰ کے اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکے تھے۔ اس ماجرے کا کچھ حال خود مولانا کی زبان سے سنئے

"وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوے سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمے سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا گوشہ گوشہ، چپہ چپہ ہشیاری و بینش کا مرقع تھا۔ بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا۔ پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ جھونپڑیوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے۔ خاک پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بارہا اترنا پڑتا تاکہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھلنا پڑتا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ دیں۔ فرشتوں نے بازو تھامے کہ لغزش نہ ہو جائے۔ سورج چراغ لیکر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اتار دیئے۔ سارے پردے کھلے ہو گئے۔ سب کی ابروؤں میں اشارے تھے۔ سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں۔ سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کیلئے دراز تھے۔ ناز دل کو چھیڑا تو ساز ہستی کا طنبورہ نکلا۔ بجلی کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا ایک تبسم آشکارا نکلی۔ ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آ گئے۔ مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھوں کا پیالہ نہ بھرا۔ رات معدوم کی ظلمت کی بڑی ڈھونڈ ہوئی مگر نہ ملی۔ خواب غفلت کا لاکھ پتہ پوچھا مگر کسی نے نہ بتلایا۔ جب کبھی آنکھیں بند کیں، جلتے دیکھے، جب کبھی کان بند ہوئے، صداؤں اور نواؤں سے بھر گئے۔ سورج نے کہا دو لاکھ میل دور ہوں۔ قطب شمالی سے روشنی اتری اور بولی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ بیس ہزار میل طے کرتی ہوں، مگر آنکھوں نے کہا یہ تو تارنگاہ کی پہلی منزل ہے اور دل ہنسا کہ اپنا پیام محبت جب شوق کے پروں پر اڑتا ہے تو بھلا روشنی کی لنگڑاہٹ کب اس کا ساتھ دے سکتی ہے۔ غرضکہ ہمت خوابیدہ جاگ اٹھی اور دل رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے ارمانوں کے ساتھ واپس آگیا۔

عالم آفاق و انفس میں جو کچھ ہے، اس میں سے کوئی بھی نہ تھا، جس کی ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ نہ ہو۔ سب کی زبانیں گویا، سب کے اشارے آشکارا۔ سب کی نظریں ابھری ہوئی تھیں۔ نہ کوئی لب بند تھا نہ کوئی جلوہ مستور، نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی نہ کانوں نے سننے میں۔ چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے ... اللہ اللہ دولت سعادت و قبولیت کی فراوانی اور سبحان اللہ بخشش و لطف غیبی کی بے پایانی، سمندر اس کی وسعت فیض کا ایک قطرہ، مگر یہ گستاخی ہے۔ سورج اس کے انوار کرم کی ایک شعاع مگر یہ بھی نادانی ہے ــــ"

یہ بات نہیں کہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" پر ایمان نہیں۔ ایمان ہے، پکا ایمان، یقین ہے، عین الیقین۔ مشاہدہ ہے عمر بھر کا مشاہدہ، بے شک سانس لینے والے بھی اور سانس نہ لینے والے بھی سبھی کیلئے موت مقدر ہے۔ یہ سب سچ ہے، حق ہے ــــ مگر کیا نفوس قدسیہ بھی مر جایا کرتے ہیں؟

نہیں ہرگز نہیں، نفوس قدسیہ میں سے کسی نفس پر بھی کبھی موت

جس راہ میں قدم اٹھایا، زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں پناہ لی وہی زندان ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو اس کا ذکر کیجیے۔ ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنیے۔ دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھ میں تھے نظر ایک تھی مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی۔ فسوں ساز نے اپنا فسون محبت پھونکا۔ ہر جلوہ ہوش ربا صرف اپنے ہی دام الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراک اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔"

میں نے مولانا کو پھسلانا شروع کیا۔ "پھسلانے" کا لفظ جان بوجھ کر لکھا ہے۔ بھلا مولانا کو کون پھسلا سکتا تھا مگر دل کی محبت کا عالم اور ہی ہوتا ہے۔ آخر راضی ہو گئے اور تذکرہ میں جن معاملات کا اظہار ہے ان کی شرح بھی آ گئی۔

مگر ہوا کیا —— دوسرے دن صبح ہی مسودہ لوٹا لیا۔ فرمایا —— "نظر ثانی" کر لوں۔ عرض کیا "آپ کی نظر ثانی کا حال معلوم ہے" —— یعنی مسودہ غائب۔

اور ہوا بھی یہی —— "

"سکندر تمام دُنیا کی تسخیر کی محنت سے نہیں تھکا۔ لیکن بابل کی ایک عورت جب اسکے سامنے آئی تو اپنی خواہش نفس کے اضطراب سے بےبس ہو کر گر گیا۔ سینکا نے تمام نوع انسانی کو اخلاق اور اخلاقی سعادت کی دعوت دی۔ لیکن خود اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کی منکوحہ عورت سے باز نہ رکھ سکا۔ ارسطو کے دامن علم کے دھبے بھی دُنیا گن چکی ہے —— فی الحقیقت انسانی زندگی کی یہی اخلاقی اور عملی نامرادی ہے، جو الہامی ہدایت کسی بالاتر قوت کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ انسان اپنے ذہن و جسم کی قوتوں سے سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن تکلف اور بناوٹ سے بھی اپنے آپ کو نیک نہیں بنا سکتا۔ اگر انسانی زندگی کی سعادت کے لئے اس عملی صداقت کی کچھ بھی ضرورت ہے، جسے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو ناگزیر ہے کہ عام انسانی سطح سے کوئی بلند تر ذریعہ ارشاد و ہدایت کا ہو —— مذہب اور الہام اسی ذریعہ ہدایت کا نام ہے۔"

ابوالکلام آزاد

از "الہلال"

اور سمجھتے ہو پر نہ تو راست بازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہوں کے نقش قدم چھوٹتے ہو — ؟"

ابراہیم علیہ السلام فرد واحد تھے، مگر پوری ایک امت تھی۔ بہت بڑی امت، پوری انسانی امت" اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً وَّاحِدَةً" — اور فرد واحد ابراہیم سے۔ جانے کتنی امتیں پھوٹ نکلیں اسی شجرہ طیبہ ابراہیمیہ کی ایک شاخ مولانا آزاد بھی تھے فرد واحد تو تھے، مگر اپنے وجود میں پوری ایک امت رکھتے تھے۔ اور اس امت کو بیدا بھی کر گئے۔

پھر ہم کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام مر گئے ہیں اور وہ آواز خاموش ہو چکی ہے جو پورے پچاس برس ہندوستان میں اور ساری اسلامی دنیا میں زلزلوں پر زلزلے ڈالے رہی ہے! وہ زبان ساکن ہو چکی ہے۔ جو علم و حکمت، شعر و ادب معارف الٰہیہ کے موتی بکھیرتی رہی ہے ؟
کیا یہ ممکن ہے — نہیں بالکل نہیں۔

لیکن وائے افسوس دل چاہے نہ چاہے، اس واقعہ سے انکار بھی ممکن نہیں کہ مولانا اپنے مادی جسم میں آج ہم میں موجود نہیں ہیں ...

مولانا کے بارے میں لکھا جائے گا، بہت کچھ لکھا جائے، کتابیں تصنیف ہوں گی، میں بھی نہ جانے کیا کیا لکھوں گا۔ دوسرے اہل قلم بھی نہ جانے کیا کیا لکھیں گے۔ مولانا کی تحریروں اور تصنیفوں کی ایک کمیٹی بھی بن چکی ہے۔ کمیٹی کے نتائج عمل کا انتظار کرنا چاہئے۔

ایک بڑی کتاب اپنے آپس کے تعلقات پر بہت پہلے لکھ رکھی تھی۔ اور طے تھا کہ میری موت کے بعد چھپے گی۔ یقین کرا معنی، حق الیقین، عین الیقین کہ مولانا سے بہت پہلے برسوں نہیں صدیوں پہلے کسی قبر میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہوں گا۔ لیکن ہوا کیا، وہی جو ہم آپ جانتے ہیں۔

اجازت دیجئے کہ اپنی قلمی کتاب کی ابتدائی سطریں یہاں نقل کر دوں کہ نئے سرے سے کچھ لکھنے سے زیادہ روشنی باہمی تعلقات پر پڑے گی لیکن یہ بھی کروں تو کیونکر کروں ؟

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

سنہ ۱۹۲۱ء میں ہم سب جیل کے چرند پرند بن چکے تھے۔ جیل کی عجیب زندگی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو جیل میں رہ چکے ہوں اکتا دینے والی زندگی اور ہم سیاسی قیدی تھے اور اے کلاس کے۔ کوئی کام کرنے کا نہ تھا میں نے مولانا کو اکسانا شروع کیا کہ "تذکرہ" کی دوسری جلد لکھا دیں ہفتوں "میرے بھائی" "میرے بھائی" کہہ کر ٹالتے رہے مگر میں بھلا پیچھا چھوڑنے والا تھا، تقاضا جاری رکھا آخر راضی ہو گئے۔ اور یہ کتاب لکھانا شروع کر دی۔

بولتے جاتے تھے اور میں پنسل سے گھسیٹتا جاتا تھا۔ رات کو مسودہ صاف کر لیتا تھا۔ مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھا دی کہ سامنے نہ کوئی نوٹ ہوتا تھا اور نہ کبھی مجھ سے پوچھا "کل کیا لکھوایا تھا" — دوسرے دن بیٹھے نہیں کہ بولنے کا رشتہ فوراً مل گیا

خیر مولانا کتاب لکھواتے رہے پھر میرے دل میں گدگدی پیدا ہوئی۔ مولانا نے تذکرہ میں اپنی "جوانی دیوانی" کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ اردو ادب قیامت تک فخر کرے گا میں یہاں مولانا کی اس زندگی کی تصویر خود انہیں کے فنان قلم سے پیش کرتا ہوں

"آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی۔ اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستان ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبح فریب کے لئے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے۔ نہ ناامیدی و ناکامی کی شام یہ سارا شہرستان امید اور نگارخانہ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی محویوں کے لئے بنا ہے اور گویا گوشہ گوشہ ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لئے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنے ہی گنبد غفلت اور ہنگامہ ہوس کی گونج تھی۔ یا تو گرفتار طلسم شباب کی ہوش ربائیوں کے لئے خود ساز ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے۔

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا، سرمستی و سرگرانی نے جام بھرے جنون شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھلائی دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزل مقصود سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی۔ لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا۔

الفراق اے صبر و شکیبائی الوداع اے عقل و دینا

خاموش اضطراب اس سے سب کچھ کہہ رہا تھا آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

انتقال کی خبر سننے کے ساتھ جیتی وودا ع کے یہ تمام حسرتناک مناظر مولانا کے سامنے آگئے ہوں گے اور ان پر ایک قیامت گذر گئی ہوگی۔ لیکن صبر و استقامت کا یہ عالم تھا کہ خطوط کی تسوید و نگارش رک گئی تھی لیکن بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا۔ اور اسی کے ساتھ قلعہ احمد نگر کے اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر و تبدل کے جاری رہے اس میں کوئی بظاہر فرق نہیں آیا۔ کوئی ان کو دیکھ کر محسوس ہی کرسکتا تھا کہ وہ کسی سخت قلبی اضطراب میں مبتلا ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے، جیسا کہ مولانا نے خود ہی لکھا ہے کہ۔

" قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جسم و صورت کی تھی۔
قلب و باطن کی نہ تھی جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا تھا مگر دل
کو نہیں بچا سکا تھا۔

دل دیوانہ دارم کہ در صحرا ست پنداری "

اس کے بعد وہ احمد نگر جیل سے مانکوڑہ میں تبدیل کردیئے گئے، تو طبیعت کی آمادگیوں نے بالکل ہی جواب دے دیا اس کے بعد انہوں نے صرف ایک خط ۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو لکھا جو کسی عزیز کے نام بعض سیاسی مسائل کی نسبت تھا اور اس پر وہ داستان بے ستون کوہ کن ختم ہوگئی ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو جب مانکوڑہ میں رہا ہوئے تو تمام مکتوبات نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دئے۔ ان مکتوبات کے مولانا نے خود ہی دو حصے کر دیئے۔ ایک غیر سیاسی، اور ایک سیاسی مولانا نے اپنے خاص اعزہ کے نام جو خطوط لکھے تھے وہ بھی غالباً علیحدہ کر لیئے گئے۔ یہ اگر محفوظ ہیں تو مولانا کے آئندہ سوانح نگاروں کے لئے بہترین ماخذ ثابت ہوں گے غیر سیاسی مکاتیب تمام تر مولانا شیروانی کے نام تھے۔ وہی پورے اہتمام کے ساتھ شملہ میں جہاں رہائی کے بعد ویول کانفرنس ہو رہی تھی ایک خوش نویس سے اجمل خاں کے مشورہ سے صاف کرائے گئے اور انہیں کو چھپوا کر اور پورے مجموعہ کا "غبار خاطر" نام رکھ کر مطبوعہ صورت میں مکتوب الیہ کو بھیج دیئے گئے۔

مکتوب الیہ کو مولانا سے کس حد تک قلبی تعلق تھا اس کا اندازہ ان کے ایک منظوم خط سے کیا جاسکتا ہے، جو اسی مجموعہ میں شامل ہے۔ مولانا اس وقت مرغزار کشمیر میں اپنی صحت کی متاع گم شدہ کی جستجو میں تھے۔ معالجوں نے کاشمیر کی گل پوش و گل ریز وادیوں میں اس متاع کی سراغرسانی کا مشورہ دیا تھا۔ اسی مشورہ کے مطابق وہ وہاں مقیم تھے شیروانی صاحب کا منظوم خط وہیں پہنچا۔ لکھتے ہیں:۔

محو نظارۂ گل مرع نگارے دارم — کہ ہماسش بدل زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بحضورش گذری — عرضہ وہ شوق کہ در جان فگارے دارم
در مسپر سد کہ مگر شوق پیامم دارد — سر فرود آر و مس گوئے کہ آہے دارم

مولانا نے اس کا جواب بھی خوب عنایت فرمایا

" کہہ نہیں سکتا کہ اس پیام محبت کو دل درمند نے
کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا۔ میرا اور آپکا
معاملہ تو وہ ہوگیا ہے جو غالب نے کہا تھا ؎
ماچوں تو ئی معاملہ بر خویش مت است
از شکوۂ تو شکر گذار محو ویم ما
آپ نے اپنے ان تین شعروں کا پیام دلنواز نہیں بھیجا ہے لطف و
عنایت کا ایک پورا دفتر کھول دیا ہے۔
قلل منک یکفینی ولاکن
قلیلک لایقال لہ قلیل"

مولانا شیروانی کے انہیں چند خطوط سے جو مجموعہ میں شامل ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اور مولانا کس حد تک متحد المذاق، متحد الفکر اور متحد الخیال تھے۔ اور مولانا کے خطوط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی مشغولیتیں بظاہر جیسی بھی رہی ہوں، علم و ارباب علم سے جتنا بھی انقطاع رہا ہو، لیکن ان پر ہر حالی میں علم و ادب ہی غالب تھا۔ اور انہیں سے وہ زیادہ بے تکلفی سے مخاطب بھی ہوتے تھے جن میں یہ جوہر پاتے تھے ان کی مخصوص صحبتوں میں سیاست و پولیٹکس کا تو جس میں بظاہر از سرتا بقدم غرق تھے۔ نام بھی سرے سے نہیں آتا تھا۔ اگر کبھی کوئی جویائے علم قرآن اپنے اشکالات پیش کردیتا تو ان کی طبع رواں اور زیادہ جولانی میں آجاتی معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی قرآن پاک کے فکر و تردد سے فارغ ہوئے ہیں۔ مولانا کا اصل مذاق یہی تھا۔ اور یہی بحمد للہ عمر کے آخر تک غالب رہا۔ یہ اور بات ہے کہ فرصت تنگ حوصلہ نے علم و فن کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں دیا سب سے بڑا ان کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی تفسیر ترجمان القرآن "تک مکمل نہ کرسکے۔ جس کی تکمیل کی ساری دنیا منتظر تھی۔ جو یقیناً ہماری اور آپکی خوبیٔ قسمت سے مکمل ہوگئی ہوتی۔ تو محض تفسیر ہی نہیں قرآن کی انسائیکلوپیڈیا ہوتی۔ اور اس نقطۂ نظر سے انہوں نے اس کو لکھنا بھی شروع کیا تھا

بہر حال "غبار خاطر" کی یہ تمام تحریریں ہیں تو بظاہر خطوط ہی۔ اور

ابوعلی اعظمی

غبارِ خاطر ـــــ ایک تاثر

مولانا ابوالکلام کے خطوط کا مجموعہ "غبارِ خاطر" میں کُل ۲۴ خطوط ہیں، ان میں شروع کے تین خطوط تو رہائی کے بعد کے ہیں جو انہوں نے سری نگر کشمیر سے جہاں وہ اپنی صحت کی بحالی کے لیے مقیم تھے، مولانا شیروانی کو لکھے تھے، اس کے بعد ایک طویل خط جو ۳ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو لکھا ہوا ہے، قید ہونے سے ایک ہفتہ پہلے کا ہے، جس کو وہ کاموں کے ہجوم میں اجمل خاں کو دینا بھول گئے اور وہ اٹیچی کیس ہی میں پڑا رہ گیا اور مکتوب الیہ تک نہ پہنچ سکا اس کا خیال آیا تو اس وقت جب اس کے بھیجنے کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور دنیا کے سارے علائق ان سے منقطع ہو چکے تھے۔ مولانا نے اسے اٹیچی کیس سے نکال کر مسودات کے فائل میں رکھ دیا اور فائل کو صندوق میں بند کر دیا، کہ داشتہ آید بکار۔

اس کے بعد وہ خطوط ہیں جو انہوں نے قلعہ احمد نگر کی تنہائیوں میں چینی چائے کی سرمستیوں اور سرجوشیوں میں لکھے تھے لیکن وہ جیل کی پابندیوں کی وجہ سے مکتوب الیہ تک پہنچائے نہ جا سکے، اور جمع ہوتے رہے۔ ان خطوط کی نگارش کا سلسلہ قلعہ احمد نگر میں پہنچنے کے دوسرے ہی دن سے شروع ہو گیا تھا اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مولانا ۱۰ اگست کو حسبِ معمول صبح تین بجے اٹھ گئے چائے دم کی، فنجان سامنے رکھا اور خیالات میں ڈوب گئے اچانک ان کو وہ خط جو ۳ اگست کو دورانِ سفر ریل میں لکھا تھا اور اٹیچی کیس میں پڑا رہ گیا تھا یاد آ گیا اس کو دیکھ کر بے اختیار ان کا جی چاہا کہ عالمِ خیال میں کچھ دیر مولانا شیروانی کی مخاطبت میں صرف کریں۔ چنانچہ اسی عالم میں ایک مکتوب قلمبند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوب قلمبند ہوتے رہے آگے چل کر مولانا شیروانی کے ساتھ بعض دیگر احباب و اعزا کی یاد بھی سامنے آئی اور ان سے بھی مخاطبت کو جی چاہا اور ان کو بھی خطوط لکھے لیکن قید خانہ کے باہر کی دنیا سے سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل تمام تر پردۂ غیب میں مستور رہتا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح دلِ مستمند پر چھا گئی تھیں، کہ قلم لکھنے کے لیے اٹھا لیتے تھے تو پھر رکنے کو جی نہیں چاہتا تھا مولانا نے یوں لکھا ہے کہ:

"لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا کبھی بال کبوتر سے میرے حصہ میں عنقا آیا۔"

ایں رسم و راہ تازہ ز حرمانِ عہد ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود

اس سے زیادہ موثر الفاظ میں اس وقت کی بے بسی اور کس مپرسی کا نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ ۱۰ اگست سنہ ۱۹۴۲ء سے لے کر مئی سنہ ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد رک گیا ۹ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء کو وہ حادثۂ محزنہ پیش آ گیا جس سے ان کی زندگی کا سارا نشاط ختم ہو گیا یعنی ان کی اہلیہ محترمہ بی بی زلیخا کا ایک طویل اور صبر آزما علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ اور وہ مولانا سے بہت دور کلکتہ میں مدفون ہوئیں۔ مولانا نہ ان کی جانکسل علالت میں ان تک پہنچ سکے، نہ وفات کے بعد پہنچنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکی۔ صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں، اور پیدا بھی ہوئیں لیکن ان کی طبعِ غیور نے ان کو گوارا نہیں کیا۔ مولانا نے خود ہی لکھا ہے کہ جس دن خطرناک علالت کا تار جیل میں ملا ہے، اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ جیل ان کے پاس آیا کہ اگر اس بارے میں وہ حکومت سے کچھ کہنا چاہتے ہیں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دیگا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی وہ صورتِ حال سے بیحد متاثر تھا۔ اور مولانا کو اپنی ہمدردی کا پورا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن مولانا نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنی چاہتے۔ زندگی کے یہ لمحات جس کرب و بے چینی میں گزرے ہوں گے ان کا اندازہ وہی کر سکتا ہے، جو ان صبر آزما حالات سے گزرا ہو۔ ۳ اگست کو جب وہ گھر سے بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگے تو حسبِ معمول زلیخا بی بی دروازے تک ان کو خدا حافظ کہنے کے لیے آئی تھیں۔ مولانا نے ان سے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہ آ گیا تو ۱۳ اگست تک انشاءاللہ واپس آ جاؤں گا انہوں نے اس کے جواب میں "خدا حافظ" کے سوا اور کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ کچھ کہنا بھی چاہتیں تو کیا کہتیں ان کے چہرے کا

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

چند یادیں

۱۹۰۵ء کا آخری زمانہ تھا، جب یہ نام اول اول نظر سے گذرا۔ الندوہ مرحوم کے ایک محترم مضمون نگار کی حیثیت سے۔ میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ غالباً نویں درجہ کا۔ اور مرحوم اُسوقت بھی تحریر میں ایک امتیازی مقام حاصل کر چکے تھے۔ سن میں مجھ سے کل ۳، ۴ سال بڑے تھے۔ الندوہ مولانا شبلی نعمانی کی ادارت میں وقت کا ممتاز ترین ماہنامہ علمی اعتبار سے تھا اس کی مضمون نگاری بجائے خود ایک اعلیٰ سند تھی اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید شہادت کی ضرورت ہی نہ تھی ـــــ مولانا اسوقت تک "مولانا" نہ تھے، محض ابوالکلام آزاد تھے ماہنامہ خدنگ نظر (لکھنؤ) میں ایک آدھ مضمون لکھ چکے تھے۔ اور اور شاید ایک ہفتہ وار "لسان الصدق" (کلکتہ) بھی کچھ دن تک نکال چکے تھے۔ بہرحال الندوہ میں موضوعِ تحریر فرید وجدی مصری کی کتاب المرأۃ المسلمہ تھی، جسے مولانا نے عربی سے اُردو میں اپنا لیا تھا اور اس میں جدید طبقہ کے جواب میں طبی، شرعی، ہر قسم کے دلائل سے یہ دکھایا تھا کہ عورت، مرد کے برابر نہیں اور دونوں کی مساوات کا دعویٰ تمام تر غلط ہے۔ مضمون نگار کی طرف سے دل و دماغ میں عظمت پیدا کرنے کے لئے بس اسی قدر کافی تھا ـــــ ایک آدھ پرچہ میں بلند پایہ مصری رسالوں سے ماخوذ "علمی خبریں" بھی اسی قلم سے نکلیں۔ زورِ قلم اور جوشِ تحریر سے ایسا اندازہ ہوتا کہ شخصیت بھی بڑی ہی زوردار ہوگی اور صورت کا نقشہ ذہن کے سامنے یہ جما کہ بڑے کلّے ٹھلے کے ہوں گے آواز سب پر غالب رہتی ہوگی۔ کسی کو اپنے سامنے بولنے نہ دیتے ہوں گے۔

دو ڈھائی سال اور گذرے۔ میں لکھنؤ میں کالج کا طالب علم تھا، کہ سردی کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت دو چار ساتھیوں سمیت کسی ضرورت سے اسٹیشن جاتا ہوا، پلیٹ فارم پر دیکھا کہ سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم سے ایک نوجوان سگریٹ پیتے برآمد ہوئے۔ گورے، چٹے، خوش رو، جامہ زیب، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کے، سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس جوان رعنا ایسے کہ نظر ان پر خواہ مخواہ پڑے، پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ کسی نے کہا کہ کوئی ایرانی پرنس (شہزادہ) معلوم ہوتا ہے، آخر کو کھلا کہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں۔ یہ زمانہ کوئی اپریل ۱۹۰۹ء کا ہوگا۔ مولانا عرصہ ہوا الندوہ سے سبکدوش ہوکر لکھنؤ چھوڑ چکے تھے کچھ دنوں تک امرتسر کے معروف و معزز سہ روزہ وکیل میں رہے تھے اور اور بھی رسالوں میں ان کا نام آنے لگا تھا ـــــ اصل صورت خیالی صورت سے بالکل مختلف نکلی اور کہیں زیادہ حسین و جاذبِ نظر۔

ملاقات اور ذاتی حصول نیاز کی نوبت اس کے بھی بعد آئی سنہ غالباً ۱۹۱۰ء تھا اور آزاد، اسوقت مولانا شبلی کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے مولانا اس وقت محلہ احاطہ فقیر محمد خاں کی ایک گلی کے اندر ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کا نام ان کی زبان پر صرف "آزاد" تھا نہ مولوی، نہ مولانا، نہ محی الدین، نہ ابوالکلام، بلکہ صرف آزاد، زبان پر بھی یہی اور خطوط میں قلم پر بھی یہی ـــ غیر معمولی ذہانت، خطابت، طراری، طلاقت لسانی کے قصے اسی زمانے سے سننے میں آنے لگے۔ لیکن مولانا شبلی کے ساتھ میں نے انہیں ہمیشہ با ادب ہی پایا تنہائی کی صحبتوں میں ممکن ہے کہ بے تکلفی زیادہ رہتی ہوں لیکن بہرحال میری شہادت تو اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی چیزوں تک محدود رہے گی۔

اسی کے بعد غالباً ۱۹۱۲ء میں الہلال اُفق کلکتہ سے طلوع ہوا۔ اور اب مولانا کا قیام کلکتہ میں مستقل ہو چکا تھا۔ اس نے اُردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی، صورت و سیرت، مغز و قالب سب میں اپنے پیشرو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار اور جاندار، چھپائی، کاغذ، تصویریں، سب کا معیار اعلیٰ ـــــ رنگین سرورق پر ایڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا ـــ "احمد المکنیٰ بابی الکلام الدہلوی" یہ "المکنیٰ" کے صحیح تلفظ اور معنی کے لئے صراح و قاموس کی ورق گردانی کرنی پڑی اور "ایڈیٹر" کہاں! اس کی جگہ "مدیر مسئول" "محرر خصوصی" اور "رئیس قلم تحریر" جریدہ کی جگہ "مجلہ" ولایتی ڈاک کی جگہ "برید فرنگ" حیرت انگیز کی جگہ "محیر العقول"، قسم کے خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے، اور نئے اسلوب بیان،

خطوط ہی کی نیت سے وہ قلم بند بھی کی گئیں لیکن درحقیقت ان کی زندگی کی دردناک آپ بیتی ہیں، جو منتشر طور پر تمام خطوط میں پھیلی ہوئی ہیں اگر کوئی صاحب ان تمام منتشر حالات کو ترتیب کے ساتھ اکٹھا کرلے تو وہ صحیح معنیٰ میں مولانا کی خود نوشت سوانح عمری بن سکتی ہے۔ جس خود نوشت سوانح عمری کا آجکل شہرہ ہے۔ وہ ان کی نہیں ان کے دیرینہ معتقد پروفیسر ہمایوں کبیر کی لکھی ہوئی ہے اور بجائے اردو کے حیرت انگیز طور پر انگریزی میں ہے جس سے مولانا کو کوئی تعلق نہیں تھا نہ اس کو کبھی انہوں نے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ نہ کبھی اپنے ملک اور قوم کو اس میں مخاطب کیا۔ رام گڈھ کانگریس کا صدارتی ایڈریس بھی کانگریس کی روایت کے خلاف انہوں نے بجائے انگریزی میں لکھنے اور لکھوانے کے اپنی اسی محبوب زبان میں لکھا تھا جس میں اپنی ابتدائی سیاسی زندگی میں "الہلال" اور اس کے بعد "البلاغ" کے ذریعہ قوم کو مخاطب کیا تھا۔ اور اپنے منفرد اسلوب تحریر اور اعجاز بیان سے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ پھر وہ انگریزی میں کیوں لکھی گئی یہ معمہ ہم اب تک نہ سمجھ سکے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے اس کو ڈکٹیٹ Dictate کیا ہے اور پروفیسر ہمایوں کبیر نے انگریزی میں منتقل کر دیا ہے اور مکمل ہونے کے بعد اس کا ایک ایک حرف مولانا کی نظر سے گذر چکا ہے۔ لیکن یہ تمام تر دوسروں کی روایتیں ہیں خود مولانا کی کوئی تحریر اس سلسلہ میں ہماری نظر سے نہیں گذری ہے ہمارے نزدیک تو ان کی خود نوشت سوانح عمری وہی ہے جو غبار خاطر کے اوراق میں جابجا بکھری ہوئی ہے۔ اسی جادو نگار قلم سے جس کی سحر طرازیوں سے ایک زمانہ میں سارا ہندوستان مسحور ہو گیا تھا ▬

"سیلاب آتا ہے تو اس کی سطح پر سر بفلک عمارتیں حباب کی طرح تیرتی پھرتی ہیں، زلزلہ آتا ہے تو فقیروں کی جھونپڑیوں کے ساتھ قصر شاہی کے ستون بھی متزلزل ہو جاتے ہیں۔ آندھی چلتی ہے تو سب سے پہلے عظیم الشان محلوں کے کنگورے ہی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہی پانی جو طوفان بن کر موجیں مارتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابر کرم کا چھینٹا بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی زمین کی وہی حرکت جو زلزلہ بن جاتی ہے۔ ایسا بھی انقلاب ہوتا ہے کہ سبزہ کی لہک اور بوئے گل کی موج ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا وہی تند جھونکا جو آندھی بن کر چلتا تھا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ نسیم خوشگوار بن کر چلنے لگا ہے۔"

(ابوالکلام آزاد)

خاص غیاث اللغات کی استعمال فرمائی!

باضابطہ تعلیم اور اصطلاحی تدریس تو مولانا کی بھی بعض اور مشاہیر ماضی و حال کی طرح تو کچھ ایسی زیادہ نہ تھی، لیکن خدا معلوم کتنے علوم اور متعدد فنون کے خزانے دماغ میں جمع ہو گئے تھے، اور ہر وقت مستحضر، علم ہو کہ الٰہیات، فقہ ہو یا کلام، شعر و ادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاسیات، جس فن سے متعلق جو بھی موضوع ہو، بس گفتگو چھیڑنے کی دیر تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی واقف کار ہی نہیں، ماہر فن تقریر کر رہا ہے اور تقریر بھی ایسی دلآویز و مربوط کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیتی جا رہی ہے۔ غضب کا حافظہ تھا اور غضب کی خوش دماغی ——— اور زبانوں پر عبور تو اور بھی حیرت انگیز تھا اپریل ۱۹۱۲ء میں جب سید رشید رضا مصری (المنار والے) لکھنؤ علمائے ندوہ کی صدارت کو تشریف لائے تو ان آنکھوں نے دیکھا کہ ان سے برجستہ اور بے تکلف عربی میں گفتگو کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ابوالکلام ہی تھے ——— فارسی شعر میں ان کا تبحر دیکھ کر گمان یہ گذرتا تھا، کہ اساتذہ فارسی کے دیوان کے دیوان اس شخص نے نوک زبان کر لئے ہیں! ——— اور اردو کے لئے تو کچھ کہنا ہی تحصیل حاصل ہے، زبان مادری ہی، پھر بھی اس سے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر اتنی وسیع اور جامع نظر رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، بڑے بڑے اس جامعیت کے معیار پر "فیل" ہی ثابت ہوتے ہیں مستثنیٰ کسی حد تک بھی اگر کسی کی ذات رکھی جا سکتی ہے، تو وہ ابوالکلام کی اور یہ اردو کے تاریخ نگاروں کی محض کم بینی ہے کہ انہوں نے اپنی تاریخوں کو مولانا کے ذکر سے خالی رکھ چھوڑا ہے تاریخ اردو میں ان کے نام کا ایک مستقل باب ہی نہیں، بلکہ بہ حیثیت صاحب طرز انشا پرداز کے ان کے نام کا باب، باب عالی شان بھی ہونا چاہیئے۔ اردو کو انہوں نے ایک مستقل اور بالکل نیا اسلوب بیان عطا کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی اور اس اسلوب کا نباہنا اپنے بس ہی میں نہ پائے

۱۸ء تھا اور مولانا رانچی جیل میں نظر بند تھے۔ خیال آیا اور احساس پیدا ہوا کہ الہلال کے زمانہ سے جو شکر رنجی سی مولانا سے چلی آ رہی ہے، اسے بالکل دور ہو جانا چاہیئے۔ معذرت کا خط ڈرتے ڈرتے لکھا، کہ دیکھیئے جواب کیا آتا ہے۔ جواب جو آیا محض ضابطہ کا نہیں، شرافت اور اعلیٰ ظرفی کے کمال کا مظہر تھا۔ الہلال کی بندش خود مولانا کی اسیری اور نظر بندی اور البلاغ کی چند روزہ اشاعت کے بعد سے مولانا کا رنگ دوسرا۔ اب ان کا شمار ملک کے صف اول کے لیڈروں میں تھا اور دعوت کا رخ بھی ہندوستانی قومیت کی طرف پھر گیا تھا۔ اب رفتہ رفتہ وہ کانگریس کے بڑوں میں تھے اور ان کی مانگ ہر بڑے سیاسی جلسے میں ہونے لگی۔ لیڈروں میں اب وہ اتنا گھر گئے تھے، کہ ہم قدیم بے تکلف نیازمندوں کی رسائی بھی ان تک مشکل تھی۔ پھر بھی کسی درجہ میں وہ اپنی وضعداری کو نبھائے گئے ——— ۲۵ء تھا کہ خلافت کمیٹی کے رشتے سے تعلقات کی تجدید از سر نو ہوئی اور ملاقاتیں جلد جلد ہونے لگیں۔ اب مولانا صدر خلافت تھے اور یہ نیازمند بھی ایک چھوٹا موٹا سا صدر اپنے صوبہ کی خلافت کمیٹی کا۔ سالانہ جلسوں کے علاوہ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر مجلس عاملہ خلافت کے جلسے بار بار ہوتے اور کانپور، لکھنؤ کے علاوہ دہلی میں بھی بارہا نیاز کے مواقع ملے۔

اواخر ۲۸ء میں "نہرو رپورٹ" کی اشاعت کے بعد سے پھر تعلقات گھٹ گئے اور ہم دونوں کی سیاسی راہیں الگ ہوتی چلی گئیں، پھر بھی مولانا نے تمام تر اس نیازمند کو فراموش نہ کیا اور آخری بار جیل سے نکلنے کے بعد جب غبار خاطر شائع کی تو اس کا ایک نسخہ لطف فرمایا۔ یہ بات شاید ۴۵ء کی ہے۔ ۴۷ء میں جب مولانا سرکار ہند میں وزارت تعلیم کے منصب پر فائز ہوئے تو بجائے خالص مبارکباد پیش کرنے کے اس گستاخ نے ڈھٹائی کے ساتھ خط بھی اس قسم کا لکھ مارا کہ "اس سرکاری تقرر سے تو ہم نیازمندانِ قدیم کو کچھ زیادہ خوشی نہیں جی یہ چاہتا تھا کہ اس سرکاری تعلق سے جہاں ہر وقت سالقہ کاغذات پر دستخط کرنے اور فائلوں کی ورق گردانی سے رہے گا آپ آزاد رہ کر سرکار ہند کے ایک غیر سرکاری مشیر اعلیٰ وزارت علوم و معارف رہتے۔"

۴۸ء تھا کہ آل انڈیا ریڈیو مشورتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی جانا ہوا۔ مولانا اسی تپاک اور گرمجوشی سے ملے کہ جیسے پہلے کسی زمانہ میں ملتے تھے۔ وزارت ہند کی اونچی کرسی کوئی فرق اس میں پیدا نہ کر سکی۔ دوپہر کے لنچ پر بلایا اور اسی روز پشاور کے خان عبدالغنی (فرزند خان عبدالغفار) بھی موجود تھے ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں وہی شور، وہی طلاقت لسانی، وہی جامعیت و ہمہ گیری سننے والا حیران و ششدر، خوش خلقی، انسانی ہمدردی، مرنجاں مرنجی میں پہلے سے کہیں آگے بڑھے ہوئے تعلّی و ترقی کے بجائے پیکر تواضع بنے ہوئے۔ شرافت نفس اور عالی ظرفی کا یہ عالم کہ اپنے مخالفین خصوصاً مسلم لیگ کے لئے گلہ شکوہ کا شائبہ بھی زبان پر نہیں، سب کا ذکر یکساں خوش دلی سے، بلکہ پاکستان کے حق میں بجائے حکایت و شماتت طنز و تعریض کے الٹا کلمہ خیر! اور کچھ اس قسم کے الفاظ، کہ اب جبکہ وہ بن چکا ہے تو ہم سب کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ طاقتور بنے! سیاسی لیڈروں میں اس ظرف کی مثال نادر ہی ملے گی۔

ہر حقیقتہ اس ادبی و علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر آنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکّہ رائج الوقت بن گئے! — حالی و شبلی کی سلاست و سادگی سر پیٹتی رہی۔ اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق موجودہ بابائے اُردو ! سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے!

الہلال نکلتے ہی ابوالکلام مسلّم طور پر "مولانا" ہو گئے اور شہرت کے پَروں سے اُڑنے لگے۔ الہلال کی مانگ گھر گھر ہونے لگی اور مولانا کی خطابت کے جوہر بھی اسی وقت سے خوب چمکے۔ ہر جلسہ کی رونق ان کی ذات سے ہونے لگی۔ الہلال بظاہر ایک سیاسی پرچہ تھا، لیکن اس کی دعوت تمام تر دینی رنگ میں تھی۔ اور اس کی سیاست پر بین الملّی اسلامیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ بات بات پر آیاتِ قرآنی سے استدلال و استناد علمی ادبی پہلو بھی نمایاں تھے اور فکاہی رنگ بھی کچھ کم شوخ نہ تھا اچھے اچھوں کی قلعی اس کے کالموں میں کھل جاتی اور بڑے بڑے اس سے ٹکر لیتے، دیتے ہچکچاتے تھے۔ مولانا کی بے پناہ ذہانت، فطانت، حاضر جوابی، برجستہ گوئی، بذلہ سنجی کا نمایاں ترین دور یہی رہا ہے۔ لکھنؤ آتے جاتے رہتے، قیام شروع میں مولانا شبلی کے ہاں رہا (جو اب خود نئے بنے ہوئے امین آباد پارک کے ایک بالاخانے پر اٹھ آئے تھے اور الفاروق و سیرۃ النعمان سے کہیں زیادہ اب شعر العجم کے مصنف نظر آنے لگے تھے اور مولوی سے بڑھ کر غزل گو، شاعر اور نقاد کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے) پھر جب مولانا لکھنؤ سے منتقل ہو کر اپنے وطن اعظم گڈھ چلے گئے، تو بھوپال ہاؤس (جس کا اب وجود بھی باقی نہیں) لال باغ میں نواب صفی الدولہ حسام الملک علی حسن خاں بھوپالی کے ہاں بھی ایک آدھ بار ٹھہرے اور اس کے بعد اپنے لئے مستقل مہمان خانہ حسین گنج کے سول اینڈ ملٹری ہوٹل (موجودہ برلنگٹن ہوٹل) کو بنا لیا تھا — الہلال کی دعوت سے اسوقت کے اس ملحد نیاز مند کو اتفاق کیونکر ہو سکتا تھا، چہ جائیکہ جب کوئی علمی رعب بھی دماغ پر مولانا شبلی کی طرح ان کا نہ تھا اور دل میں ان کی وقعت بجائے کسی عالم و فاضل کے محض ایک لسان اور پر جوش خطیب کی تھی، ادھر مولانا شبلی نے یہ کیا کہ میرا ایک آدھ مضمون (انگریزی سے ترجمہ) جو الندوہ کے لئے لکھا گیا تھا۔ الہلال کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کی تاب میں نہ لا سکا۔ اور طبیعت جو اس نو عمری کے جوش میں بحث و جدل کے لئے بہانہ ڈھونڈھ رہی تھی کچھ ہی روز بعد بعض اصطلاحات علمی کی آڑ میں صاحب الہلال سے الجھ ہی پڑی دو چار مضمون خوب گرما گرم نکلے، وہ تو خدا بھلا کرے ایک فاضل ندوی دوست کا جنھوں نے درمیان میں پڑ کر یہ سلسلہ رکوا دیا، ورنہ نوبت خدا جانے کہاں تک جا پہنچتی۔

یہ سب کچھ تو اخباری صفحات پر ہوتا رہا، لیکن مولانا کا ظرف اور جوہر شرافت جو آگے چل کر بہت نمایاں ہوا۔ اسوقت بھی بہرحال اتنا موجود تھا کہ اس نے کوئی اثر نجی تعلقات پر نہ پڑنے دیا آپس کی خط و کتابت اسی طرح جاری رہی جیسے پہلے تھی اور مولانا جواب پابندی کے ساتھ اور دوستی شفقت و محبت کے لہجہ میں بدستور دیتے رہے۔ لکھنؤ اب جب بھی آئے تو مان و نمک کیلئے ایک آدھ بار غریب خانہ کو بھی سرفراز کیا۔ اور جب اس کا موقع نہ نکل سکا، تو میں نے خود ہی حاضر مولانا کے ہوٹل پہنچا دیا میں اسوقت تک وریا بادی نہیں، لکھنوی ہی تھا — اسی زمانہ میں کہ یہ ذکر جون ۱۹۱۳ء کا ہے ایم' اے کا امتحان دے چکنے کے بعد میرا جانا کلکتہ کا ہوا تو مولانا نے اصرار کر کے اپنے ہاں میکلوڈ روڈ پر ٹھہرایا اور خوب خاطریں کر کے مہمان نوازی کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ ضمناً و تبعاً ہی لیکن بہرحال یہ بات بھی اس منزل پر سُن لینے کے قابل ہے کہ یہ وہ وقت تھا جب الہلال کے اسٹاف میں بہترین اشخاص کا مجمع تھا، تین نام یاد رہ گئے۔ حامد علی صدیقی، مولانا عبداللہ عمادی اور سب سے بڑھ کر مولانا سید سلیمان ندوی — روزنامہ کیلئے نہیں، ایک ہفتہ وار کے لئے اتنا بڑا اور ایسا کھرا اسٹاف اُردو صحافت کی تاریخ میں کسی اور کو کہیں نصیب ہوا ہوگا!

جن لوگوں نے مولانا کو بہ ایں سنجیدگی و وقار ان کی زندگی کے آخری ۲۵، ۳۰ سال میں دیکھا ہے وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ سنہ ۱۳ء سنہ ۱۴ء میں کیا تھے (اور اس سے بھی قبل یعنی اپنی بھرپور جوانی نہیں بلکہ آغاز جوانی کے سِن میں وہ کیا تھے اسے تو رہنے ہی دیجئے) ذہانت و فطانت کا مجسمہ، شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع، حاضر جوابی میں طاق، لطیفہ گوئی میں اُستاد، اسے چھیڑا، اسے بنایا، اس پر فقرہ چست کیا، اسے چٹکیوں میں اُڑا دیا، لوگ تنہا ملتے جلتے، سامنا کرتے گھبراتے، ہچکچاتے اور کنی کاٹ جاتے سنہ ۱۳ء کا آخر تھا یا ۱۴ء کا شروع۔ لکھنؤ میں کھانے پر بلانے کو تو بلا لیا لیکن فکر یہ ہوئی کہ اتنی دیر مسلسل ہدف ان حضرت کے گرما گرم فقروں کا کون بنا رہے گا؟ — اپنے جوار میں ایک بڑے طرار، شوخ گفتار، طلق اللسان، خوش بیان، ادیب و ظریف چودھری محمد علی ردولوی تھے (تھے، بقید ماضی نہیں، ماشاء اللہ اسوقت بھی ہیں) بس انہیں گھیر گھار کر لے آیا گیا، اور ہم تماشائیوں کو لطف مہذب و شستہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور برابر کی نوک جھونک کا آ رہا — چودھری صاحب نے کہیں اپنے حلقۂ ظرافت کی اصلاح "بور" BORE چلا دی، مولانا نے فرمایا کہ آپ کی تعریف؟ چودھری صاحب بولے بور مردے ست کم عقل کہ بے ارادہ دیگران را مکلف باشد۔ مولانا نے داد دی کہ سبحان اللہ، تعریف کے لئے زبان بھی آپ نے

غبارِ خاطر ایسی ہی اہم اور دلچسپ کتاب ہے

مقدمے میں مرتب نے لکھا ہے کہ مولانا جب اپنی طرزِ خاص میں شعروں کا استعمال کرتے ہیں تو جاذبیتِ تحریر دوبالا ہو جاتی ہے۔ مگر میری رائے میں بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ کبھی کبھی کوئی برمحل شعر اگر آ جائے تو لاکلام تحریر کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے مگر مولانا جس طرح شعروں کی ڈھیں اپنی تحریر میں صف بستہ کر دیتے ہیں اس سے ذہن پر ایک فوجی قبضے کا سا احساس ہونے لگتا ہے اور طبیعت ایک بوجھ اور تکلف سا محسوس کرنے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب طبیعت میں آمد نہیں ہوتی تو شعروں کا سہارا لیتے ہیں مگر جب آمد کا زور ہوتا ہے تو دیر تک کسی شعر کی صورت بھی دکھائی نہیں دیتی۔ غبارِ خاطر میں ایسے مقام موجود ہیں جہاں کئی صفحوں کے بعد کہیں کسی شعر کی جلوہ گری تحریر کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے اور پھر ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ مولانا زیادہ تر فارسی اشعار سے اپنی عبارت کو سجاتے ہیں بعض جگہ عربی اشعار اور آیتوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ اسلئے بھی تحریر میں تکلف اور رکاوٹ سا آ جاتا ہے۔ غریب اور نامانوس ترکیبوں اور لفظوں کا استعمال بھی پڑھنے والے کو چونکاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ساری کتاب علمی مذاق رکھنے والے منتہی لوگوں کے لئے ہی لکھی گئی ہے حالانکہ جب بھی کتاب چھپتی ہے تو اس پر یہ قید نہیں رہتی کہ اسے صرف منتہی لوگ ہی پڑھیں[1] میں نے اس سے پہلے غبارِ خاطر کی بڑی ہوا باندھی ہے اور اب ذرا تنقیدی انداز اختیار کیا ہے اس سے بعض طبیعتیں میرے بیان کو متضاد سمجھ سکتی ہیں مگر میں کیا کروں۔ کتاب میں بھی تو تضاد موجود ہے۔

اور یہ تضاد دراصل مولانا کی شخصیت کا تضاد ہے جو اس کتاب میں موجود ہے جیسے ان کی شخصیت سے بغیر متاثر رہنا ناممکن ہے اسی طرح ان تضادوں اور نقصوں سے دامن بچانا بھی ممکن نہیں ان کی ذات میں انا اور خود پسندی بظاہر کہیں دکھائی نہیں دیتی مگر جب آپ اس کتاب میں موجود شخصیت کو جانچیں گے تو انا اور خود پسندی کو اپنی پوری تلخی اور سختی کے ساتھ موجود پائیں گے۔ ایسے ایک خط میں وہ چائے نوشی کے سلسلے میں اپنے مذاق اور سلیقے کا اظہار کرتے ہیں تو اپنی پسند ہی کو حقیقی اور جائز سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اس معاملہ میں تقریباً بد مذاق ـــــ کیونکہ اس معاملے میں وہ لوگ جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں ان کے ہمنوا یا ہم مشرب نہیں۔ جہاں تک کہ پسند کا سوال ہے ہر شخص کو اپنی پسند کو اختیار کرنے کا حق حاصل ہے مگر ایک حد تک اگر اس کی مولانا آزاد اسے ہم دیتے نہیں اور مجھے افسوس ہے وہ میری تحریر کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ مگر میں جو کچھ لکھ رہا ہوں پورے خلوص، دیانت اور سچائی کے جذبے کے زیرِ اثر اس لئے مجھے ان کی روح سے شرمسار ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ بعض اختلاف کے باوجود بھی میں مولانا مرحوم کا مداح ہوں۔

انکے پاس ایک سائنسی اور سوچنے والا دماغ تھا اور سینے میں زندگی سے محبت کرنے والا گرم دل۔ وہ زمانے کے مادی حالات سے غیر متاثر نہیں تھے ادھر مذہبی دنیا میں جو ان کا مقام بن چکا تھا اس سے الگ رہنا بھی ان کیلئے ممکن نہیں تھا

غبارِ خاطر کے صفحوں میں اس مسئلے پر بھی انہوں نے اظہارِ خیال کیا ہے لیکن اصل بات میں گنجلک پیدا ہو گئی ہے۔ کم از کم ایک سائنٹفک بحث کو محض شاعرانہ طرز و اسلوب کے حوالے کر دینا موضوع کو نظر انداز کرنا ہی ہو سکتا ہے مگر ان کی فکر اور ان کا دماغ اس سوال کو کس صورت میں دیکھتے ہیں اس کی غمازی باوجود شاعرانہ انداز کے ان کی تحریر کرتی ہے،

مولانا اپنی انفرادی سوچوں، تجربوں اور مطالعوں کی وجہ سے ایسے مقام تک ضرور پہنچ چکے تھے کہ حقیقی منزل کو محسوس کر سکتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسان کو مذہب کی ضرورت رہے گی۔ اب نہ جانے ان کے ذہن میں مذہب کا کون سا تصور ہے۔ اگر مذہب کے معنی راستے یا چند اخلاقی سماجی اور معاشی اصولوں کے ہیں تو اس کی احتیاج مسلّم ہے۔ اور ضرورت خود اپنے لئے راستہ نکال لیتی ہے۔ ارتقا کے اس لمبے زمانے میں انسانی سماج نے اپنے لئے وقت کی ضرورت کے مطابق سب کچھ بنایا ہے یا یوں کہئے کہ تعمیر کیا ہے یہی حالت مذہب کی بھی رہی ہے۔ مولانا اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ مذہب کی موجودہ شکل کسی طرح صحیح نہیں یعنی وہ صرف اضافی چیز ہو کر رہ گیا ہے اسکی شکل یا تو خاندانی ہے یا ملبوسی دراصل دل جس کو مانے وہ صورت نہیں مگر سوال اٹھتا ہے، ایسا ہو بھی کیوں کر سکتا ہے۔ کیا آجکل انسان آج سے ہزار سال پہلے کا انسان ہی رہا ہے۔ یا اس کی عام زندگی اور اس کی ضرورتوں میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے؟ ظاہر ہے آج کا انسان اور اس کی زندگی پہلے کی صورت سے کہیں آگے نکل آئی ہے اور مادی حالت اسے وقت کی ضرورت کے مطابق سوچنے اور عمل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ پھر وہ پرانے مذہبی احکامات کو کس طرح بسر و چشم مانے کچھ لوگ اعتقادی کے مذہبی ہیں عملی طور پر یہ ہر شخص اپنے مذہبی احکام اور اعتقادات کی نفی یا اختلاف کرتا ہے۔

ہاں زندگی کے دوسرے معاملوں میں وہ بے خوفی اور کسی کی رعایت کئے

[1] خطوط لکھتے وقت مقصود اشاعت نہیں تھا۔

تاجور سامری

غبارِ خاطر ـــــ ایک مطالعہ

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

انسانوں کی طرح کتابوں کی بھی اپنی شخصیت ہوتی ہے اسی اعتبار سے اس میں جاذبیت اور اہمیت بھی، بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں، جو تھوڑی دیر کے لئے متاثر کرتی ہیں بعض آئینہ دل و دماغ کے سامنے سے بغیر کوئی واضح عکس ڈالے گذر جاتی ہیں، اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن کی ایسی انفرادیت ہوتی ہے جن کا عکس پائیدار اور گہرا ہوتا ہے جو اس آئینہ کی تہہ کا حصہ بن جاتا ہے یہی عالم کتابوں کا ہے اہم شخصیتوں کی طرح بعض کتابیں بھی اہم ہوتی ہیں جو اپنی خوبیوں اور جاذبیتوں کے کارن آئینہ دل و دماغ پر اپنا گہرا نقش جماتی ہیں۔

ایسی ہی کتابوں میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر بھی ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت اپنی رنگا رنگیوں کی وجہ سے میرے دل پر حاوی نہیں تھی۔ ان کی عظمت سیاسی اور وطنی احساسات اور شہرت کی بنیادوں پر قائم تھی۔ کبھی کبھی ان کا کوئی مضمون نگاہ سے گذرا بھی تو اسی احترام سے پڑھا جو اس عظمت سے متاثر تھا جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اتفاق سے ان کی اس تصنیف کے پہلے ایڈیشن کا نسخہ جو چھوٹی تقطیع پر چھپا تھا مجھے مل گیا۔ مگر اسے پڑھنے کی نوبت نہ آئی برسوں بعد اب ایک اور نسخہ حاصل ہوا کیونکہ پہلا میری بے توجہی کی نذر ہو چکا تھا اس تازہ نسخہ کو پڑھنے کے شوق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا کی شخصیت کے کئی دوسرے پہلو بھی اب تک زمانے پر واضح ہو چکے تھے اور میں ان سے ایک قربت محسوس کرنے لگا۔ کئی مرتبہ ان کی تقریر اور شخصیت کی جھلک بھی پا چکا تھا اور اس کے علاوہ میرا اپنا شعور بھی پختہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ چند بیٹھکوں میں اسے ختم کر دیا میں ناول قسم کی کتابوں کو عام طور سے ایک یا دو نشستوں میں پڑھ کر الگ کر دیتا ہوں مگر علمی اور ادبی نوعیت کی خاص کتابوں کو مزا لے لے کر پڑھتا ہوں اور اس عمل کو طویل کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ اس لطف کا دور ذرا دیر تک قائم رہے ـــ یہی برتاؤ میں نے غبارِ خاطر سے کیا۔ لکھنے کو تو میں نے لکھ دیا کہ چند نشستوں میں اسے ختم کر دیا۔ مگر عالم یہ تھا کہ جب گھر لوٹتا تو ایک کشش سی مجھے فوراً کتاب کو اٹھا لینے پر مجبور کرتی۔ گھر میں سکون کی حالت کچھ واجبی سی ہے بچوں کے شور اور چیخنے چلانے سے مطالعہ کا جاری رکھنا بہت مشکل ہے اسی لئے میں عام طور سے رات کو نو بجے کے بعد جب سب سو جاتے ہیں اپنے اس احساس سے ملتا ہوں یا صبح چار بجے معمولاً میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں لکھنے پڑھنے کے شغل کو جاری رکھ سکتا ہوں مگر غبارِ خاطر کی کشش نے مجھے اس وقت کے تعیّنات کا پابند نہیں رہنے دیا نہ بچوں کے شور و شغب کی پرواہ کی نہ دن بھر کی ماندگی کا فکر چنانچہ اس طرح میں اس دنیا میں چند دنوں تک سرگرداں رہا اب جبکہ غبار خاطر ختم کر چکا ہوں۔ اور وہ کتابوں کی الماری میں اپنی جگہ آرام کر رہی ہے میں ابھی تک اس کو اپنے دل و دماغ پر حاوی پاتا ہوں۔ میں نے مولانا آزاد کی سبھی کتابیں نہیں پڑھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے موضوع مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکے۔ لیکن اس پر بھی میرا یہ خیال ہے کہ غبار خاطر مولانا کی سب سے اہم اور خاص تصنیف ہے۔ اور اگر مولانا گرفتار ہو کر قلعہ احمد نگر میں نظر بند رہنے پر مجبور نہ ہوتے تو اس کتاب کا وجود میں آنا ممکن نہ تھا اس لئے ہمیں اس دلکش اور اہم کتاب کے لئے قلعہ احمد نگر کا ممنون ہونا چاہئے کیونکہ جن تاثرات اور حالات کے زیر اثر یہ خطوط وجود میں آئے وہ قلعہ احمد نگر ہی میں میسر آ سکتے تھے جہاں ایک جبری تنہائی۔ دوستوں سے حتیٰ کہ رفیقۂ حیات سے بھی دوری ایک ایسی کیفیت تھی کہ انسان اپنے گرد خیالات اور محسوسات کا ماحول قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے غبارِ خاطر میں مولانا کی اپنی شخصیت اور فن تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے عام جلسوں اور سیاسی اجتماعوں میں ہم صرف ان کی آواز اور ظاہری صورت ہی دیکھ سکتے تھے مگر اس کتاب میں ہم انہیں اپنے بالکل قریب محسوس کرتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے وہ بغیر کسی تکلیف کے غبار خاطر کے صفحوں سے اتر کر ہمارے پاس آ جاتے ہیں۔ اتنا پاس کہ ہمیں ان کے سانس کی گرمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ ہمارے سامنے آ کر تمام لبادے اتار دیتے ہیں جن سے انکی شخصیت اکثر ڈھکی رہتی ہے وہ بے تکلف ہمارے سامنے مسکراتے ہیں گاتے ہیں ہنستے ہیں۔ بعض مرتبہ غصے میں آ کر جھلاتے ہیں اور کبھی کبھی دلچسپ کہانیاں سناتے ہیں حتیٰ کہ ان کی آواز صاف دل کی دھڑکنوں کا بول [illegible]

تبصرے

این، خانقاہی

رفیق تنہائی

تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ایڈیٹر۔

نورس (غزل نمبر)

مرتبہ :- محمد منظور احمد
ناشر :- مدرسہ فوقانیہ چوک حیدرآباد
حجم :- ۲۱۸ صفحات۔ قیمت - دو روپیہ

مدرسہ فوقانیہ چوک حیدرآباد کے طلبا کا ادبی میگزین "نورس" غزل نمبر کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ طلبا اور اساتذہ کی یہ کوشش ہر لحاظ سے قابل قدر اور لائق تحسین ہے، اور خصوصیت کے ساتھ ان حالات میں جب اردو کو زندہ رہنے اور جینے کے لئے جان لیوا اور حوصلہ شکن حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ مدرسہ فوقانیہ کی یہ پیش کش نہایت اہم اور قابل تعریف ہے۔ غزل نمبر میں دکن کے قدیم ترین شعراء سے لے کر نئی نسل کے نوجوان سخنوروں تک سب کے عہد بہ عہد مختصر حالات، انتخاب کلام اور تبصرے شامل ہیں۔ دکنی شعرا میں کچھ ایسے نام بھی شامل کر لئے گئے ہیں جن کی وطنی نسبت براہ راست حیدرآباد سے نہیں ملتی۔ بلکہ وہ حیدرآباد میں بود و باش اختیار کر لینے کی وجہ سے حیدرآبادی منسوب کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں طلبا کے مختصر اور ہلکے پھلکے مضامین شامل ہیں، جو مختلف موضوعات پر قلمبند کئے گئے ہیں۔ طلبا کی علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے، یہ مضامین کافی اچھے ہیں اور اس طرح سے ان کی مناسب حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

دوسرے حصے میں "دکن میں غزل گوئی کا آغاز" کے عنوان سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا ایک جامع اور بصیرت افروز مقالہ شامل ہے اور اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ سے لے کر نوجوان شاعر معین الدین بزمی تک سب کی غزلیات کا انتخاب معہ تبصرے و حالات کے درج کیا گیا ہے۔ نمبر اپنی جگہ بڑی جامعیت اور افادیت کا حامل ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ کتابت اور طباعت اوسط درجہ کی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں گھٹیا اگر اس طرف اور توجہ دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ ہم مرتبین کو اس پیشکش کے لئے مبارکباد دیتے ہیں۔

پڑھو اور بڑھو

مرتبہ :- محمد اسحاق صدیقی۔
ناشر :- محمد ابراہیم صدیقی، ادارہ جہاں نما۔ گوئن تالاب۔ لکھنؤ
حجم ۴۸ صفحات قیمت ۱۲؍

کم عمر بچوں سے لے کر کم پڑھے لکھے علم کے شائق بوڑھوں اور جوانوں تک سب کے لئے یہ کتاب یکساں فائدہ مند ہے۔ اردو میں بچوں کے ابتدائی لٹریچر پر کم توجہ دی گئی ہے اور ایسی کتابیں کم ملتی ہیں جو بچوں کے دل میں پڑھنے کی لگن اور علم کے شوق کو تیز کریں اور ان کے اخلاق، تربیت کی تعمیر کے لئے اہم اور موثر کام انجام دیں۔ یہ کتاب بڑی حد تک اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے مؤلف کتاب کو اس کتاب کے صلہ میں پانچ سو روپیہ کا انعام دیا ہے۔ اس مختصر سے کتابچہ میں دنیا کی درجن بھر سے زیادہ ایسی عظیم شخصیتوں کے حالات زندگی درج ہیں، جنھوں نے انتہائی دشواریوں اور محرومیوں کے باوجود علم حاصل کیا اور دنیا میں اپنی ایک نظیر چھوڑ گئے۔ کتاب سبق آموز اور مفید مطلب ہے۔

جوار بھاٹا

ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر :- تاجور سامری
مقام اشاعت :- E ۶۷ کملا نگر۔ دہلی
قیمت فی کاپی ۸؍ سالانہ چھ روپے
صفحات :- ۶۴۔

ادبی کساد بازاری کے اس دور میں معیاری رسائل کی کمی بُری طرح کھٹکتی ہے اور اچھے رسالے نظر نہیں آتے، جوار بھاٹا کا اجرا اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کے مترادف ہے۔ جوار بھاٹا کا یہ

بغیر سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ اپنی رائے کے اظہار میں انہوں نے نہ کسی بڑی شخصیت کی پرواکی نہ کسی حکومت کے دبدبے اور طاقت کی یہاں بھی ان کی خود پسندی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ مگر ان کا یہ عجیب طرز ان کے پرانے جاگیردارانہ ماحول کا نتیجہ ہے۔ ویسے ان کی شخصیت میں انسان دوستی کا جذبہ اہمیت اور فوقیت رکھتا ہے۔

اس قسم کے مسائل سے ہٹ کر جب وہ ذاتی تجربے یا قصے کہانی کے انداز میں باتیں کرتے ہیں تو پڑھنے والے کو چلتی پھرتی زندگی کا تصور دکھاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کو ایسے انداز سے کہتے ہیں کہ وہ بڑی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ چڑیا چڑے کی کہانی اور حکایت زاغ و بلبل میں انکی تحریر میں دلکشی ہے اسلوب مشکل ہونے پر بھی عام فہم اور دلچسپ ہے۔ ان مضامین میں ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک معمر انسان کی جگہ ایک طفل سادہ لوح ہیں۔ وہ بڑی بے تکلفی اور چاؤ سے پرندوں سے کھیلتے ہیں اور ان سے دوستی کے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ یہاں ان کا زندگی سے پیار کا جذبہ واضح صورت اختیار کر لیتا ہے۔

غبار خاطر ان کی شخصیت کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے اور اور خوبیٔ تحریر پڑھنے والے کو ان کی ذاتی دلچسپیوں میں حصہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے جب وہ تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ پڑھنے والا اسی زمانے میں خود موجود ہے۔

مولانا عوام کے مرکز سے دور رہے اور انہوں نے جو کچھ لکھا کتابی زبان میں لکھا۔ ان کی تحریر میں محاوروں اور روزمرہ کی چاشنی کم ہے۔ لیکن جو اسلوب انہوں نے اپنے حالات کے مطابق اختیار کیا اس کو حسن و خوبی سے نباہا۔ اور مثالی صورت دیکر زمانے کے حوالے کر دیا۔ اب اگر اس سے بدعت پھیلی اور لوگ اس کی تقلید میں گمراہ ہوئے تو اس میں مولانا آزاد کا کیا قصور؟

غبار خاطر اپنی بے شمار خوبیوں سے زندہ رہے گی۔ اور اسکی انفرادیت اور اہمیت کو زمانے کے سرد و گرم نقصان نہ پہنچا سکیں گے ■

بقیہ صفحہ ۱۰۴ سے آگے:-

"نبضِ دوراں"

مصنف - انور صابری
ناشر - اظہر صابری، صابری بکڈپو۔ دیوبند۔ سہارنپور
قیمت تین روپے آٹھ آنے - حجم ۲۱۶ صفحات

انور صابری عہد حاضر کے نامور اور مقبول و مشہور شاعر ہیں خوش گو، اور خوش فکر۔ ان کا تازہ مجموعۂ کلام "نبضِ دوراں" چھپ کر حال ہی میں مارکیٹ میں آیا ہے۔ انور صابری کی حیثیت قطع نظر دوسرے پہلوؤں کے اس لحاظ سے بھی بہت اہم اور دلکش ہے کہ آپ کے دم سے ملک کے طول و عرض میں آئے دن ہونے والی ادبی محفلوں اور مشاعروں کی رونق اور دلچسپیاں قائم ہیں۔ صاف ستھرے کلام اور صحت مند شاعری کے ساتھ ہی ساتھ ان کی مشاعروں میں شرکت اور اس سے بھی بڑھ کر انکی پرکشش اور پراثر آواز نے بحیثیت ایک شاعر کے ان کو عوام میں پسندیدہ اور مقبول بنا دیا ہے۔ گنتی کے چند ہی نام ایسے ملینگے جن پر ہمارے مشاعروں کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔ اور ان ناموں میں انور صابری کا نام سرِ فہرست ہے ——— اُردو کے موجودہ دور میں جب گمراہ کن سیاست کے ساحرانہ اُردو کی بساط کو اُلٹ دینے کی کوششوں میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے، انور صابری جیسے شعراء کا دم غنیمت ہے جن کو عوام میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ سنا جاتا ہے۔

"نبضِ دوراں" کی اشاعت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ انور صابری کے پسند کرنے والے، اور شائقین کلام اب صرف مجالس و جلوت ہی میں نہیں، بلکہ "خلوت" میں بھی ان سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

انور صابری کی شاعری کی داغ بیل پڑنے کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی جنگِ آزادی شباب پر تھی۔ اس وقت بھی صابری کی آواز مجاہدینِ آزادی کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جن عناصر سے صابری کی شاعری مرکب ہوئی ہے ان میں اپنے زمانے کے مخصوص رجحانات کو بہت بڑا دخل ہے۔ وہ ادب میں سدھار وادی ہیں اور اصلاح پسند نقطہ نظر کی چھاپ ان کی زندگی اور شاعری پر بڑی گہری ہے۔ تاہم سدھار واد۔ اور اصلاح پسندی کی یبوست اور خشکی ان کے یہاں نہیں۔ رنگین بیانی۔ ندرت۔ سلاست۔ تاثر روانی اور نغمگی جیسی فنی خصوصیات نے ان کی شاعری کو بڑا موثر اور دل پسند بنا دیا ہے۔ زیر نظر مجموعہ تمام تر ان کی غزلیات پر مشتمل ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ غزل کے فن کو صابری نے کتنی احتیاط اور چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔

مولانا آزاد کا تاریخی کارنامہ

غُبارِ خاطر

کوئی شبہ نہیں کہ مولانا آزاد کی شخصیت اپنے وقت کی عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیت تھی۔ غبار خاطر ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جسکو ملک وملت اور ادب وانشاء کی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے قلعہ احمد نگر کے ایام قید و بند میں جب رسل و رسائل کے سارے ذرائع منقطع ہو گئے تھے، کس مپرسی اور لاچاری کی حالت میں لکھے۔ ان میں مولانا کی شخصیت اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ منعکس ہو گئی ہے۔ تازہ ترین ایڈیشن طباعت و کتابت کے پورے حسن اور سلیقہ سے چھاپا گیا ہے۔ قیمت چھ روپے

آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی

عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات، کہانیاں اور داستانیں نہیں ہوتیں کہ پڑھ کر لطف لیا جائے بلکہ وہ ایک مشعل ہوتی ہے جس سے آنے والوں کو راستے کا سراغ اور منزل کا نشان ملتا ہے۔ یہ مولانا کی مکمل سوانح حیات ہے جس میں ان کے خاندانی حالات بچپن کے واقعات جوانی کے کارنامے اور ادب و سیاست کے مشغلے بڑے دلچسپ اور موثر پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ مولانا ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی روزمرہ کی زبان کو قلمبند کر کے ان کی زندگی کے ایک ایک پہلو کو اجاگر کیا ہے، اور یہی اس کتاب کی خوبی ہے، کہ ہم خود مولانا کی زبانی ان کی زندگی کے حالات سنتے ہیں — قیمت چھ روپے

صُبحِ اُمید

اب جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے درمیان نہیں ہیں ضرورت ہے کہ ان کے زبان و قلم سے جو کچھ نکلا ہے محفوظ کر لیا جائے کہ یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جس پر ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ صبح امید مولانا آزاد کے منتخب سیاسی تعلیمی اور مذہبی مضامین اور خطبات کا مجموعہ ہے اور تحریری اجازت نامہ عکسی بلاک خود مولانا کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے دیگر تصاویر بھی کتاب میں شامل ہیں۔ اس کتاب کی حیثیت اسلئے بھی مسلم ہے کہ اس میں مولانا کے افکار و نظریات اور اصول و پیغامات کی روشنی میں مولانا کی شخصیت اور ملک و ملت کے حالات کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔ قیمت جلد اوّل چھ روپے

خطبات آزاد

الفاظ کے ان شعلوں کی تپش ہرگز سرد نہیں پڑ سکتی، جو ایک عرصہ تک ملت خوابیدہ کی روحوں کو تپاتے اور دلوں کو گرماتے رہے ہیں، مولانا آزاد کے خطبات کا مجموعہ "خطبات آزاد" کے نام سے شائع ہو گیا ہے ان خطبات میں وہی تپش، وہی گرمی، وہی حدت اور وہی حرارت ہے جو قدرت نے مولانا کی زبان و قلم کو بخشی تھی۔ ضرورت ہے کہ ہم آج بھی ان شعلوں سے گرمی اور حرارت حاصل کریں۔

قیمت تین روپے بارہ آنے

شہیدِ اعظم

واقعہ کربلا پر ان گنت کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر ایسی ہیں، جو من گھڑت قصوں اور روایتی افسانوں پر مبنی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "شہید اعظم" میں واقعات کربلا کو اپنے مخصوص دلنشیں پیرایہ میں قلمبند کر کے انتہائی صداقت اور سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے، یہ کتاب مولانا کی تلاش و تحقیق کا ایک نادر نمونہ ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

آثار ابوالکلام آزاد

"لیلیٰ کے خطوط" کے مشہور و معروف مصنف قاضی عبدالغفار کی یہ تصنیف اپنی متعدد خصوصیات کی وجہ سے ایک ممتاز اور منفرد حیثیت کی مالک ہے اس میں قاضی عبدالغفار نے مولانا کی شخصیت اور نفسیات کو انکے ادبی اور قلمی کارناموں میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، کتاب بے حد دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔

قیمت تین روپے بارہ آنے

مکتبہ شاہراہ — اردو بازار — دہلی

پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے اور اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر فاضل مدیر مستقبل میں اس کو زندہ اور جاری رکھ سکے اور آج کی بدترین حالت کا شدت سے مقابلہ کرتے رہے تو یہ پرچہ اپنی ایک منفرد جگہ اور مستقل حیثیت کا حامل ہوگا۔ پہلے شمارہ میں ہی کافی جاندار اور کام کی چیزیں موجود ہیں۔ فکر تونسوی کا طنزیہ "سڑک کا ایک گڑھا" طنز کا کامیاب نمونہ ہے۔ مخمور جالندھری نے ہندوستان کی فلمی صنعت اور اس کے مسائل پر ایک گہری نظر ڈالی ہے۔ حماد اس اختر نے مغرب کی جنگ باز اور ترقی پسند قوتوں کی قلعی اپنے مخصوص انداز میں کھولی ہے۔ افسانوی باب بھی کافی جاندار اور متاثر کن ہے۔ سیاست، فلم، ادب اور آرٹ پر صحت مند اور ترقی پسندانہ نقطۂ نگاہ سے اچھے مضامین مرتب کئے ہیں اور ہر مذاق کے لئے تھوڑا بہت مواد اس میں موجود ہے۔ حصۂ نظم بہت کمزور ہے۔ اختصار کے باوجود اچھے فن پارے پیش نہیں کئے گئے۔ کئی چیزیں تو بالکل فرمائشی اور بھرتی کی دی گئی ہیں ہمیں امید ہے کہ مدیر جوار بھاٹا اگلے شمارہ میں اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

شکستِ جام

مصنف۔ عرش صہبائی

ناشر۔ جوگندر قمر، اردو ادب جموں

قیمت۔ دو روپے

حجم: ۱۱۱ صفحات

جواں العمر شاعر عرش صہبائی، کئی سال سے رسائل و جرائد میں نظر آتے رہے ہیں، اور اب یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو "شکستِ جام" کے نام سے جموں سے شائع ہوا ہے۔ مجموعہ کو دیکھ کر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پختہ کلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سو صفحے کے اس مجموعے میں اکیاون عمدہ غزلیں موجود ہیں، جو اس بات کی شہادت کرتی ہیں کہ عرش کی شاعری جو بہت کم عمر ہے مستقبل میں کافی بلندی اور کامیابی کے امکانات رکھتی ہے۔ اسلوب بیاں میں انفرادیت اور بیاں نظر آتا ہے۔ نت نئی ردیفیں تلاش کرنے میں اور خوبصورتی کے ساتھ ان کو نباہنے میں عرش نے اپنی مشاقی اور جستجو کا ثبوت دیا ہے۔ کلام میں رنگینی اور اثر ہے۔ نمونے کے طور پر چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

کہیں باتوں ہی باتوں میں نہ پھر تکرار ہو جائے

وہیں پر بات رہنے دو، جہاں تک بات آپہونچی

★

آپ کو بھی دیکھنے والے نہ دیوانہ کہیں

بے تکلف اس طرح بیٹھیں نہ دیوانے کے پاس

★

اس طرح رہیئے، نگاہوں کے قریب

میرا مفہومِ نظر سمجھا یئے

★

آپ کرتے ہیں مری تلخ نوائی کا گلہ

یہ بھی پوچھا ہے، دلِ زار پہ کیا گذری ہے

★

کاٹی ہے ہم نے شامِ ہجراں میں تمام عمر

اے دوست اکوئی صبحِ بہاراں کی بات کر

★

چند آنسو، چند آہیں، ساتھ کچھ مجبوریاں

اور اپنی داستاں کو مختصر کیا کیجئے

عرش کا کلام، صاف ستھرا اور عامیانہ روش سے دور ہے اس میں ادبی لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی ہے زیرِ نظر مجموعہ شاعر کے ادبی سفر کا نقشِ اول ہے، ہم آئندہ اور گہرے، مستقل اور پائیدار نقوش کی عرش سے توقع رکھتے ہیں۔

ہائے محبت ہائے زمانے

مصنف نور بجنوری

پبلشر کتب میلر ایبک روڈ۔ لاہور۔

قیمت۔ چار روپے چار آنے حجم ۲۸۶ صفحات۔

نور بجنوری کا نام بحیثیت شاعر کے ہند و پاک میں کافی مشہور ہے۔ وہ ایک عرصہ سے لکھ رہے ہیں، اور شاعری میں اپنا ایک مخصوص لہجہ اور منفرد رنگ رکھتے ہیں۔ ناول نگار کی حیثیت سے ان کا نام ہمارے لئے بالکل نیا اور چونکا دینے والا ہے۔ "ہائے محبت ہائے زمانے" ان کا پہلا ناول ہے اور خوب ہے۔ اس ناول میں زبان اور طرزِ تحریر کی نفاست اور خوبیاں تو موجود ہیں ہی ٹیکنیک اور موضوع کے لحاظ سے بھی کتاب غیر اہم نہیں ہے۔ یوں تو رومانی ناول اُردو میں بہت لکھے گئے ہیں لیکن نور بجنوری کا ناول متوسط طبقے کے ایک عام نوجوان کی نفسیاتی، جنسی اور رومانی زندگی سے پوری فنکاری کے ساتھ پردہ اُٹھاتا ہے اور اس طرح وہ درمیانی طبقے کی مخصوص زندگی اور ذہنی کشمکش کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ نور کا یہ ناول ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کریگا۔

(بقیہ صفحہ ۱۰۳ پر)

شاہراہ کے خاص نمبر

طنز و مزاح نمبر

تاریخ ہے، اُردو ادب کے گذشتہ دس برس کے طنزیہ مضامین کی۔
کاری ضرب ہے، رجعت پرستوں کی قلعہ بندیوں پر۔
زہریلا قہقہہ ہے، فرسودہ سماجی اور سیاسی نظام کی چیرہ دستیوں پر۔
جامِ جہاں نما ہے، زندگی کے حقائق کا اور مستقبل کی تابانیوں کا۔
نگار خانہ ہے، بصیرت افروز اور پردہ کشا کارٹونوں کا۔

مرتبہ ——— فکر تونسوی

ضخامت ۵۲۰ صفحات ——— قیمت تین روپے

سالنامہ ۱۹۵۶ء

شاہراہ کا یہ سالنامہ بھی اپنے اندر وہ تمام خصوصیات رکھتا ہے، جو اس کے ہر سالنامے کی بہترین خصوصیات اور روایات رہی ہیں ۵۶ء کے سالنامے کی سب سے بڑی اہمیت اس لئے ہے کہ اس میں ہر صنف ادب کے متعلق گراں بہا تحقیقات اور معرکتہ الآرا مضامین کا بیش قیمت سرمایہ ملتا ہے۔

مرتبہ ——— فکر تونسوی

ضخامت ۱۵۰ صفحے ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

مجاز نمبر

ماتمی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی کہانیاں
شاعرِ شہر نگار کی یاد میں

ادارہ شاہراہ نے شاہراہ کا مجاز نمبر پیش کیا ہے اس نمبر میں اُردو کے محبوب ترین، جواں مرگ شاعر اسرار الحق مجاز کی زندگی فن اور شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بیش قیمت مضامین شامل ہیں۔ اور جنہیں ہندو پاک کے نامور ادیبوں نے اپنی یادوں کے سہارے قلمبند کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

ناولٹ نمبر

عالمی ادب کے شاہکاروں کی تاریخی دستاویز

شاہراہ کا ناولٹ نمبر ——— جس کو ادبی حلقے ہاتھوں ہاتھ قبول کر رہے ہیں۔

ناولٹ نمبر میں دنیا کے پندرہ عظیم ادیبوں کی زندۂ جاوید تخلیقات شامل ہیں۔

ناولٹ نمبر کا ہر ناولٹ شاہراہ ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ساتسو صفحات کا یہ نمبر ادیبوں اور مترجموں کی تصاویر سے مزین ہے۔ مزید برآں ادیبوں کے حالاتِ زندگی بھی درج اشاعت ہیں قیمت سات روپے

سالانہ چندہ دس روپے ——— عام ماہانہ پرچہ دس آنے

دیوانِ غالب مصوّر عکسی

غالب جیسے عظیم شاعر اور اس کے کلام کو جتنی بھی خوبصورتی اور زیبائش کے ساتھ سجا بنا کر پیش کیا جائے، کم ہے۔ کلام غالب کے کتنے ہی ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ مکتبہ شاہراہ نے کوشش کی ہے کہ یہ ایڈیشن غالب جیسی عالمگیر شخصیت کی شان اور حیثیت کے مطابق ہو۔ کتاب بہترین ڈرائنگ پیپر پر فوٹو آفسیٹ سے چھاپی گئی ہے۔ چغتائی آرٹ نے جو تصویروں میں اشعار کی تفسیر کی ہے کتاب کی نفاست اور حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ہر تصویر ایک متحرک اور بولتا ہوا شعر ہے۔ اور ہر شعر تصویر کے روپ میں ایک زندہ پیکر۔

سائز $\frac{۲۶ \times ۳۰}{۸}$ ——— قیمت دس روپے

آتشِ گل

رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی کا دوسرا مجموعہ کلام "سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری" ——— یہی وہ عناصر ترکیبی ہیں جن سے جگر کی شاعری مرکب ہوئی ہے۔ "آتشِ گل" اردو غزل گوئی کی تاریخ میں یقیناً ایک مینارۂ نور ہے۔ اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ہم توقع کر سکتے ہیں کتاب کی حیثیت کا اندازہ یوں کیجئے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس کو سال کی بہترین کتاب منتخب کی ہے، اور مصنف کو پانچ ہزار روپے کا انعام مرحمت فرمایا ہے طباعت و کتابت بہترین۔ خوشنما جلد

قیمت چھ روپے

چشمہ

اسے آر خاتون کا نام اردو ناول نگاروں کی صف میں اس قدر نمایاں اور عام پہچانا ہے کہ مزید تعارف کیلئے کچھ کہنا بیکار ہے ان کے پہلے ناول عوام سے داد و تحسین اور مقبولیت کا خراج حاصل کر چکے ہیں۔ خاتون کا نام ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ "چشمہ" جو ان کا تازہ ترین ناول ہے، فن، ٹیکنیک، مواد اور اسلوب کے لحاظ سے کس قدر نفیس اور معیاری ہوگا۔ چشمہ بلاشبہ اردو ناولوں کے ذخیروں میں ایک قابل قدر اور گراں بہا اضافہ ہے۔

قیمت دس روپے بارہ آنے

ٹیگور کی کہانیاں

عالمگیر شہرت کے حامل اور زندۂ جاوید انسانیت دوست ادیب رابندرناتھ ٹیگور کی منتخب کہانیوں کا اردو ترجمہ، جس میں ٹیگور کی انسان دوستی، دردمندی اور آفاق گیر شخصیت پوری طرح نمایاں ہے۔

قیمت دو روپے

چنگ و رُباب

کنہیا لال کپور طنز کے تیز نشتروں سے سماج کے زخموں کو چھیڑتا بھی ہے، اور ان پر مرہم بھی لگاتا ہے۔ اس کے قلم میں زہر بھی ہے اور تریاق بھی۔ "چنگ و رباب" اس کے تازہ ترین طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اس کی تمام صلاحیتیں پوری طرح اُبھر کر آگئی ہیں۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے

اپنی منزل اپنی راہیں

مصنف ——— ولیم سرویان

ولیم سرویان کا شہرۂ آفاق ناول "اپنی منزل اپنی راہیں" کے نام سے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ ریڈر کمار نشچل نے اس کا اردو ترجمہ اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ ترجمہ میں اصل کا لطف آتا ہے۔ بہترین کاغذ، نفیس گٹ اپ، عمدہ طباعت اور شاندار کتابت۔

قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے

مکتبہ ——— شاہراہ ——— اردو بازار ——— دہلی

ان کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے

ادبی تنقیدی کتب

تاریخ ادب اُردو	رام بابو سکسینہ	۱۰/۰	گل بکاؤلی	نولکشور	۰/۱۱/	ڈوبتے سائے	عادل رشید	۲/۰
تاریخ ادبیات ایران	ترجمہ سید مبارز الدین	۹/۰	معرکۂ چکبست و شرر		۲/	برباد آشیانے	״	۵/۰
احوال غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	۹/۰	آثار ابوالکلام آزاد	قاضی عبدالغفار	۲/۱۲	تشنگی	رشید اختر ندوی	۲/۸
۵۱ء کا بہترین ادب	مکتبہ شاہراہ	۵/۸	عود ہندی	غالب	۱/۸	باپ اور بیٹے	تورگنیف	۱/۸
قنوطیت اُردو ادب میں	لطیف اعظمی	۲/	ہماری شاعری	حسن عسکری	۳/۰	تنہائی کا کنواں	״	۱/۸
ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	احتشام حسین	۲/۸	زبان داغ	رفیق مارہروی	۳/۸	چوگان ہستی مکمل	منشی پریم چند	۱۱/۰
ادبی اور قومی تذکرے	کشن پرشاد کول	۱۱/۰	مال ویر	کنہیا لال کپور	۲/۸	گوشۂ عافیت مکمل	״	۱۰/۰
حیات اجمل	قاضی عبدالغفار	۸/	بزم بے تکلف	سید عابد حسین	۲/۸	بازار حسن	״	۴/۸
فلسفۂ کلام غالب	شوکت سبزواری	۳/۴	اُردو کے چاند ستارے	امیر حسن نورانی	۳/۸	نرملا	״	۲/۸
تنقیدات عبدالحق	عبدالحق	۲/۴	مشاعرہ عالم ارواح	مرتضیٰ حسین	۲/۰	جلوۂ ایثار	״	۲/۰
تحقیقات	عندلیب شادانی	۵/۸	فکر و فن	خلیل الرحمٰن	۳/۰	پردۂ مجاز	״	۶/۰
اصغر	پروفیسر عبدالشکور	۲/۱۲	**ناول**			غبن	״	۵/۰
مختصر تاریخ ادب اُردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	۵/۸	طوفان کی کلیاں	کرشن چندر	۲/۴	تاراس بلبا	مترجم علیق انجم	۲/۸
اُردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی	۲/۸	دل کی وادیاں سو گئیں	״	۳/۰	ثمر	اے، آر خاتون	۲/۴
نقدیات	ممتاز حسین	۲/۸	ایک گدھے کی سرگذشت	״	۳/۱۵	عروسہ	״	۲/۰
آب حیات	محمد حسین آزاد	۴/۸	آسمان روشن ہے	״	۲/۱۲	نور	منشی فیاض علی	۴/۸
آب حیات کے لطیفے	حسین علوی	۱/۸	باون پتے	״	۶/۰	شمیم	״	۲/۸
بیان غالب	باقر	۶/	ان داتا	״	۲/۱۲	بار خاطر	شوکت تھانوی	۲/
تاریخ نظم و نثر	״	۲/۸	طوفان	ٹیگور	۲/۰	شیش محل	״	۳/
آرائش محفل	نولکشور	۱/۸	جیون پربھات	״	۳/	فرار	اوم پرکاش نامی	۳/۰
داستان امیر حمزہ	״	۸/۰	ماں	میکسم گورکی	۳/۸	سسکیاں	سوشیل چودھری	۲/
اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی			مالوہ	״	۱/۱۲	انتہا	سبھاگ سنگھ	۲/۸
ترویج میں اُردو کا حصہ	ڈاکٹر عزیز	۵/۸	بھوک	نٹ ہمسن	۳/۸	بوٹا سنگھ	״	۲/۸
اُردوئے قدیم	شمس اللہ	۲/۸	آدمی اور سکے	مہندر ناتھ	۲/۱۲	اپنی منزل اپنی راہیں	وسیم سرویان	۲/۸
انوار سہیلی	״	۲/۸	وعدہ	״	۲/۸	آنکھوں آنکھوں میں نیند	ضیا عظیم آبادی	۳/۸

مکتبہ شاہراہ۔ اُردو بازار۔ دہلی

ماسکو کی اردو مطبوعات

خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز

فریڈرک اینگلس کا شہرۂ آفاق شاہکار جس میں قبل تاریخ کے زمانے سے جدید دور تک انسان کی خانہ سازی اور ریاست کے قیام کا ذکر نہایت دلچسپ پیرایہ میں کیا گیا ہے

ضخامت ۲۴۰ صفحات — قیمت صرف آٹھ آنے

کمیونسٹ تعلیم کے بارے میں

لینن کی تقریروں اور مضامین کا مجموعہ۔ اس کتاب میں کمیونزم کے نظریہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

ضخامت ۱۰۵ صفحات۔ قیمت صرف بارہ آنے

دار و رسن کی آزمائش

نکولائی آستراوسکی کا مشہور ناول

یہ ناول انقلاب کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے ہوئے ایک نوجوان کی داستان حیات ہے جو اپنی بلند حوصلگی سے ہر مشکل کو آسان بنا لیتا ہے۔

ضخامت ۷۰۰ صفحات قیمت تین روپے

کپتان کی بیٹی

الیگزنڈر پشکن جو زندگی بھر ناانصافی، ظلم اور رجعت پسند قوتوں کے خلاف لڑتا رہا اور زار شاہی روس کے ایوانوں میں رزلے ڈالتا رہا، آج ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ پشکن کا مشہور ناول "کپتان کی بیٹی" کا یہ اردو ترجمہ یقیناً ایک بڑا اضافہ ہے قیمت دو روپے چار آنے

ماں

میکسم گورکی کا شہرۂ آفاق ناول۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے

دنیا مالیت کی کہانی

نکولائی نوسوف کا ناول۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات بڑا سائز۔

قیمت ایک روپیہ تین آنے

تاریخ میں فرد کا رول

(مصنف: گ۔ و پلیخانوف)

انسان نے تاریخ سازی میں بحیثیت فرد کیا پارٹ ادا کیا ہے۔ اس کتاب میں تفصیل سے اس پر بحث کی گئی ہے۔

قیمت پانچ آنے

بستی کا پہلا بچہ

(مصنف: ملین اسپیکا ما)

اس ماہر خاتون نے اس کتاب میں باپ، ماں اور بچہ کی زندگی پر بحث کی ہے — قیمت دو آنے

وقت کی اڑان

پوستووسکی کی نئی کہانیوں کا مجموعہ۔ قیمت صرف پانچ آنے

لاہوتی

ابوالقاسم لاہوتی کا دیوان فارسی۔ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے

بچوں کے لئے

ایک مونچھوں والی چھوٹی بلی مع تصاویر۔ قیمت پانچ آنے

دو کہانیاں قیمت پانچ آنے

دستانے قیمت پانچ آنے

مکتبہ شاہراہ۔ اردو بازار۔ دہلی

شاہراہ

خانہ جنگی	محمد مجیب	۱/۰	ضربِ کلیم	اقبال	۲/۸	گھبلائے پریشاں	الیاس احمد	۶/۸
دروازہ	کرشن چندر	-/۸/-	تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۳/۸	گنجِ معانی	تلوک چند محروم	۴/۸
روحانی شادی	پریم چند	۱/۴/	پرچھائیاں	،	۱/۴	دستک	نریش کمار شاد	۴/۴
رضیہ سلطانہ	کلیم عرفی	۳/۰	گا تا جائے بنجارا	،	۳/۰	دیوانِ ذوق		۲/۸
نظم			گجر	قتیل شفائی	۳/۰	مرکز	سہیل اعظمی	۲/۰
پتھر کی دیوار	سردار جعفری	۲/۸	روزن	،	۳/۰	چراغِ فکر	من موہن تلخ	۳/۰
امن کا ستارہ	،	۱/۴	جھومر	،	۳/۰	نئے ترانے		۲/۸
ایشیا جاگ اٹھا	،	-/۱۲/-	سازو صدف	عدم	۲/۴	**لغات**		
دیوانِ غالب مصور	مکتبہ شاہراہ	۴/۰	قول و قرار	،	۲/۸	فیروز اللغات کلاں		۱۶/۸
دیوانِ حالی	حالی	۲/۴	گلنار	،	۲/۴	لغات کشوری مجلد		۹/۰
رباعیاتِ آسی	آسی	۱/۸	گردشِ جام	،	۲/۴	کریم اللغات		۲/۰
رباعیات انیس	انیس	۲/۸	بطِ مے	،	۲/۴	مصباح اللغات عربی اردو		۱۵/۰
مثنوی میر حسن	شمس بریلوی	۱/۱۲	خرابات	،	۴/۰	لغات القرآن		۱۵/
گلزارِ نسیم	،	-/۱۲/-	رمِ آہو	،	۴/۰	بیان اللسان		۱۰/۰
کلیات نظیر اکبر آبادی	نولکشور	۱۲/	رقصِ حیات	پرویز شاہدی	۳/۸	**کشیدہ کاریاں**		
نظمِ لطیف	جلال الدین	۴/۰	جمالِ مصر	نیاز حیدر	-/۱۲/-	اوشا کشیدہ کاری		۳/۸
مکمل شرح دیوان غالب	آسی	۳/۸	پھوار	نریش کمار شاد	۲/۸	رضیہ کی کشیدہ کاری		۴/
مقدمہ شعر و شاعری	حالی	۲/۸	سنگِ میل	یعقوب عثمانی	۲/۴	حسینی کشیدہ کاری		۳/۰
مسدس حالی	،	-/۱۰/	بیکراں	جگن ناتھ آزاد	۴/۸	دلہن کشیدہ کاری		۲/۸
میری نظمیں	بلراج کومل	۲/۸	ستاروں سے ذروں تک	،	۲/۱۲	زینت کشیدہ کاری		۵/۸
جاوداں	جاں نثار اختر	۳/	دیوانِ درد		۱/۸	بیگم کشیدہ کاری		۱/۰
دامِ خیال	ضیاء الاسلام	۳/۰	شہرِ آرزو	باقر مہدی	۳/۸	بیسویں صدی کی کشیدہ کاری		۴/۰
صنم و حرم	شکیل بدایونی	۲/۴	محرابِ غزل	روش صدیقی	۳/۰	رشیدہ کی کشیدہ کاری		۳/۸
رعنائیاں	،	۳/۸	نبضِ دوراں	انور صابری	۳/۸	ماڈرن کشیدہ کاری		۳/۸
آہنگ	مجاز	۳/	خرام	مہیش چندر نقش	۲/۸	قدسیہ کشیدہ کاری		۱/۰
فروزاں	جذبی	۳/۰	طلوعِ فکر	جوش ملیح آبادی	۲/۸	تسنیم کشیدہ کاری		۱/۰
شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	۵/۰	کلیاتِ اقبال	،	۵/	رائل کشیدہ کاری		۲/۰
آتشِ گل	،	۶/۰	کاغذی پیرہن	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲/۱۲	زنانہ کشیدہ کاری		۳/۱۵
بالِ جبریل	اقبال	۳/۸	گلستاں ہزار رنگ	بہار الدین	۱۰/۰	شمع کشیدہ کاری		۵/۰

مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی

خونی پھول	باقر رضا مہدی	۳/۸	سنگدل ملکہ	صادق حسین سردھنوی	۶/۰	دو ملک ایک کہانی	ابراہیم جلیس	۲/۸
وحشت دل	سعیدہ مظہر	۲/۸	سہارا	دت بھارتی	۴/۰	ایک پیسہ کی خاطر	〃	۲/۱۲
خریدار	نامی کانشاتی	۳/۰	موت سے پہلے	〃	۴/۰	سیاہ حاشیے	منٹو	۲/۰
نیند نہ آئی ساری رات	ضیا عظیم آبادی	۲/۸	حنا	ایم اسلم	۶/۸	مینا بازار	〃	۲/۴
تو آستاں سلامت	انتظار حسین	۲/	شمسہ	〃	۶/۰	سڑک کے کنارے	〃	۳/۰
تین سہیلیاں	خان محبوب طرزی	۲/۸	آخری رات	〃	۵/۰	لاؤڈ اسپیکر	〃	۴/۸
[illegible] بھی کیا بری شے ہے	〃	۳/	سمندر اور لہریں	اختر سلیمی	۴/	نو ایک قصہ سو	اختر انصاری	۲/۱۲
حمام	مائل ملیح آبادی	۴/۰	**افسانے**			۵۱ء کے بہترین افسانے	گوپال متل	۲/۴
ظلم کے سائے میں	وحشی مارہروی	۲/۰	میرے بہترین افسانے	پریم چند	۳/۸	جب کشمیر جل رہا تھا	کشمیری لال ذاکر	۲/۰
کھلاڑی	وحشی محمود آبادی	۴/۰	پریم بتیسی کامل	〃	۱۱/۰	خواب و خیال	پریم چند	۲/۸
بہو بیٹی	محمدی بیگم	۲/۰	خاک پروانہ	〃	۲/۰	خواب و خیال	مجنوں گورکھپوری	۳/
رخصتی	ح۔ب خاتون	۱/۸	دیہات کے افسانے	〃	۲/۰	جی ہاں پٹے ہیں	شوکت تھانوی	۳/۴
شیطان کی سوانح عمری	ظفر نیازی	۲/۸	پریم پچیسی کامل	〃	۵/۱۲	کلی سے پھول	ایم سکندر	۲/۰
ریشمی آنچل	ضیا عظیم آبادی	۳/۰	پریم چالیسی کامل	〃	۹/	آؤ عشق کریں	〃	۳/۰
ملار بہار	حسین علوی	۱/۸	میراث	پرکاش پنڈت	۳/۰	وائلن کے تار	بال کرشن دگل	۳/۴
موت کی لکیر		۳/۸	میں انتظار کروں گا	کرشن چندر	۲/۸	ہندوستان ہمارا	بلونت سنگھ	۳/۸
عذرا	خلیل الرحمٰن	۳/۸	نئے افسانے	〃	۳/۰	آدمی اور انڈے	موپساں	۱/۱۲
عذرا کی واپسی	〃	۳/۸	ہائیڈروجن بم کے بعد	〃	۲/۱۲	اب اور تب	ہنس راج رہبر	۲/۴
سرخ انگلیاں	عابد سہیل	۲/۰	نئے غلام	〃	۲/۱۲	سرخ حاشیے	نرش کمار شاد	۲/۱۲
دل کافر	احمد شجاع	۶/۸	ایک گرجا ایک خندق	〃	۳/۸	**ڈرامے**		
نادر شاہ	شبلی بی کام	۴/۱۲	ٹیگور کی کہانیاں	ٹیگور	۲/	انار کلی	امتیاز علی تاج	۲/۸
نجمہ	نذر سجاد حیدر	۲/۸	شعلۂ الفت	〃	۰/۱۲/۰	انار کلی کی واپسی	اظہار اثر	۳/۸
نوشابہ	یونس رمزی	۳/۸	شعلۂ اجل	〃	۰/۱۲/۰	دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	۱/۴
عالیہ	سعیدہ مظہر	۴/۰	نجات	〃	۰/۱۲/۰	آگرہ بازار	حبیب تنویر	۱/۸
میری ناتمام محبت	حجاب امتیازی	۳/۸	گارڈنر	〃	۱/۸/۰	لنگوٹی والا	کشن چند زیبا	۱/۸
بیچارہ	الفت منہاس	۵/۰	مکٹ	〃	۰/۱۲/۰	کایا پلٹ	〃	۱/۸
بن مانگے بچے	جی ایم ناز	۴/۰	سنگ ریزے	〃	۰/۱۲/۰	زخمی پنجاب	〃	۲/
انگوری	احمد شجاع	۵/۸	جیل کے دن جیل کی راتیں	ابراہیم جلیس	۳/۰	[illegible]	〃	۱/۸
چشم نم	نظر سلیم	۴/۰	آزاد غلام	〃	۲/۸	نقش آخر	اشتیاق حسین	۰/۱۰/۰

مکتبہ شاہراہ - اردو بازار - دہلی

اُردو افسانہ نگاری کا مقابلہ

ایک ہزار تین سو رُپے کے نقد انعامات

پہلا انعام	درجہ اوّل کے ایک افسانہ پر	پانچ سَو رُپے
دوسرا انعام	درجہ دوم کے ایک افسانہ پر	تین سَو رُپے
تیسرا انعام	درجہ سوم کے ایک افسانہ پر	دو سَو رُپے
چوتھا انعام	درجہ چہارم کے تین افسانوں پر بہ حصّہ مساوی	تین سَو رُپے

اِس مقابلہ میں شرکت کے لیے فیس داخلہ کچھ نہیں ہے۔ مقابلہ میں شامل ہونے کی آخری تاریخ ۵ ۲ اپریل ۱۹۵۹ء ہے

شرائط

(۱) اس مقابلہ میں صرف وہی افسانے شامل کیے جائیں گے جو کسی طبی یا صحتی موضوع پر لکھے گئے ہوں۔

(۲) اس مقابلہ میں ہر ایک افسانہ نگار کا صرف ایک ہی افسانہ شریک کیا جائے گا۔

(۳) افسانہ ہر ایک پہلو سے طبع زاد (اوریجنل) اور اُردو زبان میں لکھا ہونا چاہیے اور "ہمدرد صحت" کے چار صفحات سے زیادہ طویل نہ ہو۔

(۴) افسانہ صاف اور خوش خط حروف میں کاغذ کے صرف ایک طرف لکھا ہونا چاہیے اور صفحہ پر کچھ حاشیہ چھوڑا ہوا ہونا چاہیے۔

(۵) احتیاط کے خیال سے افسانے رجسٹرڈ پوسٹ سے روانہ کیے جائیں تو بہتر ہے۔ ڈاک میں گم شدہ افسانہ کی ذمہ داری ادارہ پر نہ ہوگی۔

(۶) افسانہ کے مسودہ میں افسانہ کے ختم پر اپنے دستخط اور پورا پتہ ضرور لکھ دیا جائے اور افسانہ کی پیشانی پر یہ الفاظ تحریر کر دیے جائیں:

"ہمدرد صحت کے افسانوی مقابلہ میں شرکت کے لیے"

(۷) ہمدرد دواخانہ کے ملازمین اس مقابلہ میں شرکت کا حق نہیں رکھتے۔

(۸) افسانوں کا انتخاب و انعامات کا فیصلہ ایک کمیٹی کرے گی جس کے ممبران کے ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ اس کمیٹی کا فیصلہ آخری و قطعی ہوگا اور مقابلہ میں شامل ہونے والے ہر ایک افسانہ نگار کو وہ فیصلہ قبول کرنا لازمی ہوگا۔

(۹) انعام پانے والے افسانوں کے جملہ حقوق طبع، اشاعت دائمی طور پر ہمدرد دواخانہ (وقف) کے لیے محفوظ ہوں گے اور وہ ان کو کسی بھی شکل میں جہاں چاہے گا استعمال کر سکے گا۔

(۱۰) غیر منتخبہ افسانے واپس نہیں کیے جائیں گے بلکہ ضائع کر دیے جائیں گے، اس لیے بہتر ہوگا کہ افسانہ نگار افسانہ بھیجنے سے پہلے اپنے افسانہ کی نقل خود محفوظ کر لیں۔

(۱۱) انعامات ہمدرد منزل، لال کنواں، دہلی میں جلسۂ انعامات میں تقسیم کیے جائیں گے، جس کی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ انعامات حاصل کرنے والوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس جلسہ میں شریک ہو کر انعام حاصل کریں۔

(۱۲) دہلی سے باہر مستقل مقیم انعام پانے والے افسانہ نگاروں کو جلسۂ انعامات میں شرکت کی صورت میں ان کے قریبی ریلوے اسٹیشن سے دہلی جنکشن تک کا سیکنڈ کلاس کے یک طرفہ ریلوے ٹکٹ کا خرچ ہمدرد دواخانہ کی طرف سے دیا جائے گا۔ قیام و طعام کا انتظام ان کو خود کرنا ہوگا۔

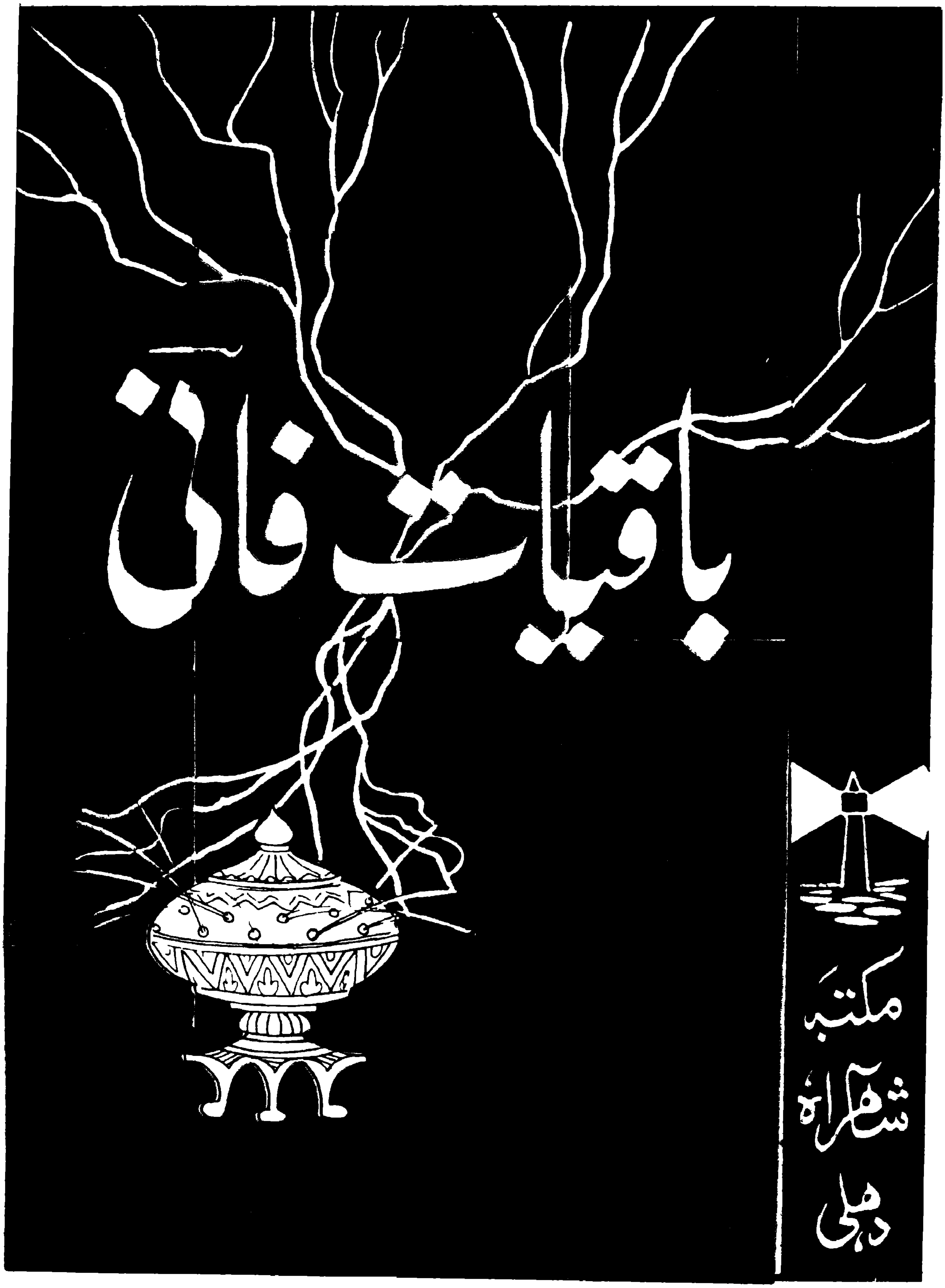
(۱۴) اس مقابلہ میں شامل ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ اپریل ۱۹۵۹ء ہے جو افسانے ۲۵ اپریل کے بعد دفتر میں پہنچیں گے، اُن کو مقابلہ میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۴) اس مقابلہ میں اُردو زبان کے صرف وہ افسانہ نگار شریک ہو سکتے ہیں، جو قومیت کے اعتبار سے ہندوستانی شہری ہیں۔

(۱۵) افسانے مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ کیے جائیں۔

ایڈیٹر "ہمدرد صحت" (افسانوی مقابلہ) دہلی ۶

hone 28782 February, 1959 D—164



PRICE Rs 3